قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۱۶	کراچی : ہفتہ ۔ ۲۱ ۔ مئی ۱۹۵۵ء	قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

قران کی رو سے فرقہ بندی خدا کا عذاب ہے۔ ایمان کے بعد کفر ہے۔ توحید نہیں بلکہ شرک ہے۔ سوال یہ ہے کہ فرقے بنتے کس طرح سے ہیں؟ اس طرح کہ لوگ خدا کی دی ہوئی شریعت کے بجائے انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور چونکہ مختلف انسانوں کی شریعتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے ان کے پیروؤں میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے الگ الگ فرقے بن جاتے ہیں۔ قران میں ہے۔ <u>ام لهم شرکاؤا شرعوا لهم من الدین مالم یاذن به الله</u> (۴۲/۲۱)۔ کیا ان کے کوئی شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کا ایسا راستہ (شریعت) مقرر کردیا ہے جس کی اجازت اللہ نہیں دیتا؟ اللہ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کوئی انسان کسی کے لئے دین کا راستہ مقرر کرے۔ دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے اور اس کی سند خدا کی کتاب ہوتی ہے۔ <u>قل ان هدی الله هوالهدی</u> (۶/۷۱) ان سے کہدو کہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی ہی حقیقی اور سچی راہ نمائی ہے۔ اس کے سوا اور کسی کی راہ نمائی قبول کرنا شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔

۱ تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات قرآن کے مطابق ہوگی صحیح ہوگی جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد و معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

۸ ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا ★ کراچی کا پانی ★ آزاد عراق ★ رہائش کا مسئلہ ★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت ★ عورت کا قران ★ مجلس اقبال ★ ابن جریر طبری ★ اندرون ہند
★ نقد و نظر ★ حقائق و عبر ★ باب المراسلات ★ بین الاقوامی جائزہ ★ عالم اسلامی

تازہ پیشکش

✡ اقبال اور قران

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

ہفتہ وار
طلوع اسلام

جلد ۸ | ۱۲ر مئی سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۶

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا

سابقہ اشاعت میں ہم نے اس جگر خراش حقیقت پر تبصرہ کیا تھا کہ موجودہ خلفشار میں ابنائے پاکستان نے سیرت و کردار کے فقدان کا ایسا مظاہرہ کیا کہ مملکت کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا لیکن

درازی شب و بیداری من ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفت است

آج کی صحبت میں ہم ایسے ایک اور گوشے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ہم میں پاکستانی شعور کا کس قدر فقدان ہے اور جب اس فقدان کا یہ عالم ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے کیونکہ

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف!

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ذرا تصور میں لائیے تقسیم سے پیشتر کے عشرے کو اور نگہ بازگشت ڈالئے اس نقشۂ سیاست پر جو طول و عرض ہند میں مسلمانوں کے موقف نے پیدا کر دیا تھا۔ آسام سے بلوچستان تک اور کشمیر سے مدراس تک کی ساری فضا ان نعروں سے معمور تھی کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ وہ علاقائی نسبتوں اور نسلی امتیازات سے اس قدر بالا ہیں کہ ایک مسلمان ہمسایہ ہندو سے مل کر نہیں بلکہ دور افتادہ ہم فکر و ہم خیال مسلمان سے مل کر ایک ملت واحدہ بنتا ہے۔ یک رنگی اور یک جہتی کا یہی جذبہ تھا جس نے تقسیم سے دو سال پیشتر ہندو اور انگریز دونوں کو یہ چیلنج دے دیا تھا کہ وہ انتخابات کے ذریعے آزما کے دیکھ لے کہ دس کروڑ مسلمان کس حد تک ایک ہی جماعت سے وابستہ ہیں اور ایک ہی مطالبہ پاکستان کے حامی اور مؤید۔ زمانہ شاہد ہے کہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے اس حقیقت کو بلا شائبہ ریب ثابت کر کے دکھا دیا۔ اسی غیر معمولی وحدت کا صدقہ تھا کہ اقبال کے خواب کی عملی تعبیر دو سال کی قلیل مدت میں متشکل ہو کر سامنے آ گئی۔

جہاں مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پاکستان خلاف توقع حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔ وہاں انہیں نقصان بھی پہنچا کہ ان کے دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب بہ لحاظ آبادی تقسیم ہو گئے گو اس تقسیم میں مسلمانوں سے سخت ناانصافی ہوئی اور کئی مسلم آبادی کے علاقے پاکستان سے کاٹ کر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے لیکن اس سے اس اصول پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ تقسیم ہند کی اساس ہندو مسلم آبادی تھی نہ کہ صوبے یا علاقے۔ اگر تقسیم "غیر فرقہ وارانہ" بنا پر یعنی علاقائی یا صوبائی اعتبار سے عمل میں آتی تو بنگال اور پنجاب کبھی تقسیم نہ ہوتے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان نے صوبوں کو تقسیم کر تو دیا مگر بدبختی پاکستان صوبائیت پر قابو نہ پا سکی اور ملت اسلامیہ پاکستانیہ یوں دیکھتے دیکھتے صوبوں میں بٹ گئی جیسے وحدت و اخوت ایک منافقانہ پردہ تھا جو ذرا سی کشاکش سے چاک ہو گیا۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک دین، ایک ملک کے نعرے لگانے والے تشتت و افتراق کی دلدل میں یوں دھنسے اور دھنستے چلے گئے کہ بنگالی سندھی، پٹھان، وغیرہ اپنے آپ کو جداگانہ قومیں تصور کرنے لگ گئے۔ اس سے بین الصوبائی رقابتوں کا گھناؤنا دور شروع ہوا۔ صوبے پاکستان پر مقدم ہو گئے اور پاکستانی شعور عنقا ہو گیا۔ پاکستان کی سات سال کی سیاست اسی کشمکش کردہ کی شرمناک داستان ہے۔ رسوائے دہر مجلس دستور ساز اسی المیہ کی ہیرو تھی۔ یہ اسی کی کارگذاری تھی کہ مشرقی پاکستان نے آزادی اور علیحدگی کے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے تھے اور جب ملک کے لئے زبان کا مسئلہ سامنے آیا تو اس نے پاکستان کو مینار بابل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مجلس مذکورہ پاکستان کو مکمل تباہی کے غار تک لے آئی تھی کہ روح پاکستان ابھری اور یہ طلسم سامری ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو محترم غلام محمد کی ضرب کلیمی سے ٹوٹ گیا۔ گورنر جنرل کے جرأت مندانہ اقدام کے بعد یہ کہا جا سکتا تھا کہ

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

اور یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ اب ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنے والا کوئی نہیں اٹھے گا۔ چنانچہ ملک میں وحدت کا پھر سے چرچا ہونے لگا۔ اور وہی ارباب سیاست جو پہلے ذاتی منافع اور صوبائی تفوق کے لئے کوشاں تھے کشادہ نگہی اور پاکستانی شعور کے مظہر بن گئے۔ اس فضا میں جو کام سات سال تک سرانجام نہیں پا سکے تھے وہ دنوں میں تکمیل کے مراحل طے کرتے نظر آئے۔ مغربی صوبوں کے خاتمے کی تفاصیل چند مہینوں میں طے پا گئیں اور آئین پاکستان کا مسودہ بھی حکومت کے ماہرین نے قلیل سی مدت میں طے کر لیا

لیکن جب عدالتی چارہ جوئیوں سے قدرے فراغت پا کر گورنر جنرل نے آئین ساز کنونشن کے انعقاد کا اعلان کیا اور اس کے لئے طریقہ انتخاب شائع کیا تو وہی ڈوبے ہوئے منحوس تارے ایک ایک کر کے ابھر آئے۔ وحدت کے گیت گانے والے افتراق و صوبائیت کے بے سرے الاپنے بیٹھے اور پھر ایسا نظر آنے لگا کہ وحدت کا جو سماں نظر آ رہا تھا وہ ایک فریب تھا۔ اس پردے میں نفاق و نفرت کے وہی دیو ناچ رہے تھے جن سے ۲۴ر اکتوبر کو بظاہر گلو خلاصی کرا لی گئی تھی۔ مشرق و مغرب میں کہیں پاکستان کا نام سنائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف صوبے ہی صوبے تھے۔ اب ذرا سوچئے کہ کنونشن کے اعلان سے ملک میں کیا صورت حال پیدا ہوئی تھی؟ واضح رہے کہ یہاں سوال کنونشن کے قانونی جواز و عدم جواز کا نہیں۔ ہم اس سے قطع نظر کر کے محض ایک اصول کی تشریح و تبیین کر رہے ہیں۔ کنونشن کا کام تسوید آئین تھا۔ لہٰذا اس کے لئے یہ خیال رکھا جانا چاہیئے تھا کہ ایسے امیدوار منتخب کئے جائیں جو دستور و آئین کو سمجھتے ہوں، نیز انہیں اس کا شعور ہو کہ بحالات موجودہ ملک کو کس قسم کے آئین کی ضرورت ہے۔ گویا معیار انتخاب اہلیت ہونا چاہیئے تھا۔ اور جب اہلیت کا سوال سامنے آتا ہے تو پھر یہ سوال غیر وقیع ہو جاتا ہے کہ کوئی اہل شخص ملک کے کس گوشے میں پیدا ہوا۔ یا اس کی اضافی نسبت کیا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب برطرف شدہ مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تو اس وقت جس شخص کو مناسب سمجھا گیا تھا منتخب کر لیا گیا تھا بغیر یہ سوچے کہ وہ کس صوبے یا کس علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں جب یہ مرحلہ پھر سے پیش آیا تو وحدت کے زبانی جمع خرچ کے باوجود صوبائیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ الامان والحفیظ!

مشرقی پاکستان سے چلئے، وہاں عوامی لیگ نے کنونشن میں شمولیت کا فیصلہ کیا لیکن شرط یہ لگائی کہ اس میں عوامی لیگ کے ارکان بھیجے جائیں۔ شاید اپنی جماعت تک محدود رہنا آج کی سیاست میں قابل فہم ہو۔ ہمارے نزدیک یہ قابل معافی نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس جماعت نے اتنی عالی ظرفی کا بھی ثبوت نہیں دیا کہ صوبائی جماعت کے دائرہ سے باہر نکل کر کسی دوسرے صوبے سے عوامی لیگ کے ایک رکن کو ہی منتخب کر لیتی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کا کوئی ایک بھی ایسا قابل رکن موجود نہیں جسے مشرقی پاکستان والے بربنائے اہلیت منتخب کریں؟ لیکن یہاں سوال اہلیت کا نہیں صوبائیت کا تھا۔

اور امیدوار وہ صحیح ہے جو اپنے صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے بعد سندھ کو لیجئے۔ وزیر اعلیٰ مسٹر کھوڑو نے ایک طرف یہ اعلان کیا کہ ان کی جماعت کی تجویز یہ تھی کہ اگر پنجاب کے گورمانی صاحب چاہیں تو انہیں سندھ سے منتخب کر لیا جائے۔ قطع نظر تخمینات کے اس تجویز سے وحدت کی بو آتی تھی۔ لیکن یہی جماعت مسٹر گورمانی کے انکار کے بعد صوبائیت میں ڈوب کر اپنے لیڈر پر یہ پابندی لگا دیتی ہے کہ وہ کسی غیر سندھی کو امیدوار نامزد نہ کریں۔ بعینہٖ یہی مظاہرہ سرحد میں ہوتا ہے وہاں بھی لیڈر کو یہی "اختیار" دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے صوبے ہی کے افراد منتخب کریں۔ ذہنیت کس حد تک مسموم ہو چکی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس بیان کو سامنے لائیے جو عبدالقیوم خاں نے دیا۔ خان صاحب مسلم لیگی ہیں وہ صوبے میں وزیر اعلیٰ اور مرکز میں وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ سابقہ مجلس دستور ساز کے رکن بھی تھے اور سرحدی ہونے کے باوجود بنگال سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ "باہر کے" آدمی منتخب نہ ہوں۔ گویا غیر سرحدی سب "باہر" کے ہیں۔ معلوم نہیں یہ راز خان صاحب پر کب کھلا؟ انہیں اس اصول کا ایسا ہی پاس تھا تو انہوں نے بنگال سے منتخب ہونا کیوں گوارا کر لیا؟ کیا بنگال کے لئے وہ "باہر" کے نہیں تھے؟

صوبائیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پنجاب سے روشنی کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ وہاں سے جو نعرہ بلند ہوا وہ صوبائیت کے کہساروں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ لیکن ابھی اس کی گونج بھی ختم نہیں ہو پائی تھی کہ پنجاب کے ارباب سیاست باہم دست و گریباں ہو گئے۔ آپس میں مل کر متفقہ طور پر مرکز کو حق نامزدگی دے کر اور ضبط و اعتماد کی ایک نئی دنیا بسا کر یہ سیاسی پہلوان اکھاڑے میں اتر آئے۔ یہ مقام صوبائیت سے بھی پست تر ہے۔ یہ کچھ دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ

باوصف ادعائے ظاہری

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے صوبائیت کا یہ مظاہرہ اُس کنونشن کے سلسلہ میں روا رکھا گیا جس کا مقصد پاکستان کے لئے آئین بنانا تھا۔ ہر چند یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ آئین سازی میں جو تاخیر ہوئی ہے اور اس میں جو جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں وہ سب تخم خبیث صوبائیت کے تلخ ثمرات ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سات سال تک ان کڑوے پھلوں سے کام و دہن کا حلیہ بگاڑنے کے باوجود ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی۔ گلو خلاصی کی کوشش تو ایک طرف رہی، الٹا انہی کو جان بخش و حیات آور سمجھا جا رہا ہے یوں تو ہمارے نزدیک کوئی ایسا مفاد نہیں جسے صوبائی قرار دے کر عمومی پاکستانی مفاد پر اسے مقدم سمجھا جائے۔ کیونکہ ملکی مفاد میں سب کا مفاد ہوتا ہے، لیکن اگر صوبائی مفاد کے لئے کوئی وجہ جواز ہو سکتی تھی تو اس کے لئے مناسب میدان مغربی پاکستان کی انتظامی کونسل تھی نہ کہ آئین ساز کنونشن (اور جہاں تک انتظامی کونسل کا تعلق ہے اس میں خوب دل کھول کر صوبائیت کے کھیل کھیلے گئے ہیں۔ مغربی وحدت کے تانے بانے میں صوبائیت کے جن تاروں کی آمیزش پائی جاتی ہے اس پر تفصیلی تبصرہ طلوع اسلام میں آ چکا ہے)

یہ تو کنونشن کے بارے میں ہوا۔ اب کنونشن کی بجائے مجلس دستور ساز منعقد ہو گی، اس نام کی تبدیلی سے اس ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جس کا ماتم سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ قدرت نے ہمیں ایک اور موقع عطا کر دیا ہے اور پھر سے مہلت دیدی ہے کہ ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں اور اس فساد فکر و نظر سے بچیں جس نے ہمیں تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا تھا اس لئے ہم ارباب سیاست سے بصمیم قلب یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ صوبائیت کی "تنگ نظری" سے بچیں اور ملک کو یقینی تباہی سے بچائیں، اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم صوبائیت کے بجائے "پاکستانیت" کو اپنا شعار بنائیں۔ اگر ہم میں پاکستانی شعور اب بھی نہ ابھرا اور ہم اپنے آپ کو بدستور پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی ہی سمجھتے رہے تو وہ درخشندہ مستقبل جس کی تشکیل کی طرف قیام پاکستان قدم اول تھا ایک بھیانک منزل میں تبدیل ہو جائے گا، پھر

ہماری تباہی مقدر ہو جائے گی اور

ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

رہائش کا مسئلہ

زمانے کے حالات اب اس حد تک بدل چکے ہیں کہ معاشرہ انسانی کے وہ مسائل جو کچھ عرصہ پیشتر انفرادی طور پہ نپٹائے جایا کرتے تھے۔ آج وہ افراد کی بساط سے ایسے باہر ہو چکے ہیں کہ ان کے حل کے لئے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس راز کو سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں ایسے امور یا تو حکومت کی تحویل میں چلے گئے ہیں یا ایسے نجی اداروں کے تصرف میں جو ہیئت اور ذرائع کے اعتبار سے بجائے خود چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں وسعت پذیر معاشری مسائل کا حل چنداں دشوار نہیں رہا۔ اس کے برعکس پسماندہ اور غریب ممالک میں کہ ان کے ہاں اجتماعی شعور کا بالعموم فقدان ہے۔ ان معاملات سے انفرادی طور پر ہی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ بیشتر مسائل الجھتے جا رہے ہیں اور گوناگوں پریشانیوں کا موجب بنتے جا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر رہائشی مکانات کے سوال کو لیجئے یادداشت پر ذرا بوجھ ڈالئے۔ آپ دیکھئے گا کہ یہ ایک آسان سا مسئلہ ہوا کرتا تھا۔ مکانات بالعموم یا تو موروثی ہوا کرتے تھے یا اپنے طور پر حسب ضرورت اور استطاعت تعمیر کرائے جایا کرتے تھے یا کرایہ پر لے لئے جایا کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ جنگ اور تقسیم ہند نے اس سوال کو ایسا الجھا دیا کہ آج تک اس کا خاطر خواہ حل نہیں مل سکا۔ ہمارے ہاں مکانوں کی قلت کی دو وجوہ ہیں، ایک مفلوک الحال مہاجرین کی آمد ہے مہاجرین پاکستان میں یک لخت سیل بے پناہ کی طرح آ ہی نہیں گئے بلکہ ان کا سلسلہ تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور وہ ہر روز پاکستان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مہاجرین کھلے آسمان کے نیچے جابجا پڑے ہوئے ہیں اور دوسری وجہ نئے نئے کارخانوں کا قیام ہے۔ ان میں ہزاروں کارکن کام کرتے ہیں اور سینکڑوں ملازمت کی امید میں گرد و نواح میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کے لئے رہائش کا کوئی انتظام نہیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ اس ہمہ گیر مسئلہ کو اجتماعی طور پر حل کیا جاتا۔ یعنی ایک طرف حکومت اپنے ملازمین اور مہاجرین کے لئے وسیع پیمانہ پر مکانات تعمیر کرتی، اور دوسری طرف بڑے بڑے کارخانہ دار اپنے کارکنوں کے لئے رہائش کا انتظام کرتے۔ لیکن بلند بانگ دعووں کے باوجود اس ضمن میں جو کچھ کیا گیا وہ اصلی ضرورت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ حکومت نے انفرادی طور پر جو سہولتیں مہیا کیں وہ بجائے خود مستحسن تھیں لیکن چونکہ انجام کار ذمہ داری افراد کی تھی، اس لئے خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکی۔ کراچی میں دیکھئے گو غیر معمولی دبا ؤ سے مکانات جگہ بہ جگہ بن گئے لیکن رہائش کا مسئلہ بدستور دردسر بنا ہوا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ رفتار کار ضرورت کے مطابق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکان بنانے والوں میں زیادہ تر کم استطاعت والے ہیں۔ اور وہ انفرادی طور پر اس پر قادر نہیں کہ کم از کم وقت میں ایسے مکانات کھڑے کر دیں جو ان کی اور دوسروں کی ضرورت پوری کریں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کئی مکان تکمیل نہیں پا سکے۔ اور بہت سے ادھورے پڑے ہیں۔

ان حالات میں اگر حکومت یا بڑے بڑے تعمیری ادارے اس معاملے کو ہاتھ میں لے لیتے تو آج اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو ہمیں کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر اب بھی اس تجربے سے سبق حاصل کر لیا جائے تو اس پریشانی سے بچنے کی صورت ہو سکتی ہے۔ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی وزارت تعمیرات کراچی کے لئے ایک "تعمیری ادارہ" مقرر کرنے پر غور کر رہی ہے۔ یہ ادارہ مکان بنانے والی بڑی منتخب کمپنیوں کی مدد سے وسیع پیمانے پر مکانات تعمیر کرے گا اور انہیں آسان قسطوں پر ضرورت مندوں کو دے دیگا۔ کہا جاتا ہے کہ تین قسم کے مکان زیر تجویز ہیں۔ ایک کی قیمت پانچ ہزار روپے ہو گی۔ دوسرے کی آٹھ ہزار، اور تیسرے کی بارہ ہزار۔ مکان حاصل کرنے والوں کو شروع میں مکان کی لاگت کا بیس فی صدی حصہ ادا کرنا پڑے گا۔ اور بقایا رقم آسان قسطوں میں بے باق کرنا ہو گی۔ یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ جو حضرات یہ ادائیگی بآسانی نہیں کر سکیں گے ان کے لئے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، انشورنس کمپنیوں، بینکوں وغیرہ کے ذریعے پیسے کا انتظام کرا دیا جائے گا۔

یہ تجویز ابھی حکومت کے زیر غور ہے اور اس کی پوری تفاصیل بھی منظر عام پر نہیں آئیں۔ اس لئے ہم اس کے ما لہٗ و ما علیہ پر تفصیلی تبصرہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اصولی نقطۂ نظر سے ہم اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں اور حکومت سے التماس کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اسے منظور کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دے کیونکہ مکانوں کے ضرورتمند برسوں سے پریشان ہو رہے ہیں

اور بظاہر ان کی پریشانیوں کے خاتمے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

ہم اس بارے میں چند باتیں حکومت کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اول۔ مجوزہ ادارہ کو تجارتی خطوط پر نہیں چلانا چاہیئے۔ یہ تجربہ بہت حد تک ناکام ہو چکا ہے۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے مکان بنانے والے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس ادارے نے سود و زیاں کے تجارتی اصولوں کو مد نظر رکھا۔ اب چونکہ حکومت اس کام کو ہاتھ میں لے رہی ہے اس لئے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہ منافع بخش کاروبار نہ بن جائے۔ چونکہ تعمیر کا کام وسیع پیمانے پر ہوگا اس لئے اخراجات خود بخود مقابلتہً کم ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے کتنے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، نہ یہ کہ اس سے کس قدر منافع حاصل ہوتا ہے۔ دوئم مکانوں کو ایک طے شدہ نقشے کے مطابق بنانے سے کہیں بہتر ہوگا کہ رہنے والوں کی رائے اور ضرورت کے مطابق اس میں رد و بدل کر دیا جائے۔ اس میں گنجائش بھی رکھی جا سکتی ہے کہ اگر اس طرح اخراجات تھوڑے سے بہت بڑھ جائیں تو یہ وصول کر لئے جائیں گے۔ سوئم۔ اس تجویز کا فائدہ ان ضرورت مندوں کو بھی ملنا چاہیئے جن کے پاس اپنی زمینیں تو ہیں لیکن وہ گوناگوں دشواریوں کی بدولت مکانات تعمیر نہیں کرا سکے۔ ان سے مقررہ رقم کی بجائے اصل لاگت وصول کی جائے۔ چہارم اس وقت خیال یہ ہے کہ اگر کراچی میں یہ تجربہ کامیاب ہوا تو مجوزہ ادارے کو پاکستان بھر میں پھیلا دیا جائے گا۔ تجربے سے فائدہ اٹھانا بجا لیکن حکومت کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں سابقہ حکمت عملی جس کی رو سے افراد اپنے اپنے مکانوں کی تعمیر کے خود ذمہ دار تھے ناکام ہو چکی ہے۔ اور اب کامیابی کی یہی صورت ہے کہ تعمیر مکانات کا کام اجتماعی طریق سے سرانجام دیا جائے۔ جب یہ اصول درست ہے تو تجربے سے اس کی تفصیلات میں اصلاح و ترمیم کی جا سکتی ہے، لہٰذا اس تجربے کو کراچی تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس وقت اشد ضرورت ہے کہ لاہور پر توجہ دی جائے۔ ایک صوبے کے قیام سے لاہور میں رہائش کا مسئلہ جو پہلے ہی پریشان کن تھا، غیر معمولی طور پر پریشان کن ہو گیا ہے۔ اسے کم سے کم وقت میں حل کرنا چاہیئے۔ لہٰذا کراچی کی طرح لاہور میں بھی فی الفور ایسا ادارہ قائم کر دیا جائے۔ پنجم۔ تعمیر مکانات کا کام حکومت کے علاوہ بڑے بڑے کارخانہ دار بھی کر سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ انہیں مجبور کرے کہ وہ اپنے عملہ کے لئے مناسب مکانات تعمیر کرے۔ اس میں حکومت کا بوجھ ہلکا ہوگا، عملہ کو آسانی ہوگی اور کارخانے داروں کا بھلا ہوگا۔

کراچی کا پانی

وزارت تعمیرات کے جوائنٹ سکریٹری، مسٹر اسحاق نے پچھلے دنوں کراچی کے پانی سے متعلق جو بیان دیا وہ حد درجہ افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ افسوس یا تکلیف کی بات یہ نہیں کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ کیوں کہا، بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے آج کہا وہ آج سے بہت پہلے کیوں نہ کہہ دیا گیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ کراچی کی آبادی تقسیم کے وقت ساڑھے تین لاکھ تھی اور اب پندرہ لاکھ ہو چکی ہے۔ اور یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے مطلوبہ مقدار میں صاف ستھرا پینے کے قابل پانی مہیا کرنا آسان نہیں۔ اس کا احساس بھی اکثر لوگوں کو ہے کہ کراچی کے اپنے ذرائع آب رسانی نہ ہونے کے برابر ہیں اور شہر میں پانی دور سے اس طریق سے لانا پڑتا ہے کہ اس کے لئے بڑی محنت، سرمایہ اور فنی تجربہ درکار ہے اور ہمارے ہاں ان کا فقدان ہے۔ یہ مشکلات راہ اپنی جگہ درست، لیکن اس کا کیا جواب کہ متعلقہ ارباب حکومت ارباب شہر کو برسوں یہ سراب دکھاتے رہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ کراچی میں نہیں حل ہو جائے گا اور پھر کوئی شہری قطرۂ آب کے لئے پریشان و بے آبرو نہیں ہوگا۔ جب بھی کسی حکومتی نمائندے نے بات کی ہے اس نے یہی کہا ہے کہ مطلوبہ کام اب ہوا چاہتا ہے، اب ہوا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بڑی بڑی سکیمیں تیار ہوئیں، ان کے ڈھنڈورے پیٹے گئے اور ہمارے انجنیر یورپ اور امریکہ کی یاترا کرتے رہے۔ ہر بار ہمیں یہی بتایا جاتا رہا کہ اس منصوبہ کو تیار ہونے دیجئے، ان صاحب کو ذرا یورپ کے فلاں شہر کے طریق آب رسانی کا مطالعہ کرنے دیجئے پھر دیکھئے کیسے پانی کی دائمی نہریں بہنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں یورپ کے جتنے چکر لگائے گئے ان کا سفر خرچ جمع کیا جائے تو ان اخراجات کا معتد بہ حصہ بن جائے گا جو اچھے منصوبہ آب کے لئے درکار ہو سکتے ہیں۔

اب ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک سات کروڑ روپے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے جو ۱۹۵۷ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گا اور ۱۹۵۸ء کے دوران میں رواں ہو جائیگا۔ یہ ہو گیا تو روزانہ ۸۰ کروڑ گیلن یعنی فی کس ۵۰ گیلن پانی مہیا کیا جا سکے گا۔ اس وقت تک گویا تین سال کے لئے کراچی کو موجودہ مقدار آب پر گزارہ کرنا ہوگا۔ یہ کچھ امر واقعے کے طور پر کہا جاتا تو اہل شہر کو اس سے دکھ نہ ہوتا لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک جھوٹے وعدوں کا فریب دیا جاتا رہا۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اس قدر غلط وعدہ کرنے کی آخر کیا وجہ جواز ہے؟ اسحاق صاحب نے اپنے بیان میں خاصی صاف گوئی سے کام لیا ہے، اور ہمیں اس کی خوشی ہے کہ انہوں نے صاف بات کرنا مناسب سمجھی لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ ۱۹۵۸ء میں وہ یا ان کے جانشین ہمیں یہ نہیں سنا دیں گے کہ اب کراچی فلاں بن گیا ہے، لہٰذا پانی کی مطلوبہ مقدار کے لئے مزید تین سال انتظار کرنا ہوگا۔ ارباب حکومت نے گزشتہ آٹھ سال میں کم از کم یہ تو دیکھ لیا ہوگا کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے، الفاظ کام کا بدل نہیں ہو سکتے اور کام کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ اگر اسحاق صاحب اپنے وعدوں میں ایسے ہی سچے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ جو منصوبہ زیر تعمیر ہے، اس کی رفتار ترقی سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اہل شہر کو باخبر کرتے رہیں، اور اگر انہیں اس کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش آئے تو بعد از وقت عذر تراشی کے طور پر اسے پیش کرنے کی بجائے اس کی بابت بر وقت اطلاع دے دیں تاکہ پبلک کو صحیح حالات سے آگاہی حاصل رہے اور وہ کام کا اور کام کرنے والوں کا محاسبہ کرتی رہے۔

اسحاق صاحب نے بجا طور پر اہل شہر سے اپیل کی ہے کہ وہ پانی کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لیں۔ یہ اپیل ایسی ہے کہ جس پر ہر شہری کو عمل کرنا چاہیئے کیونکہ جو بھی پانی بچے گا ان علاقوں میں تقسیم ہو سکے گا جہاں پانی کی کمی ہے۔ لیکن حکومت کو جاننا چاہیئے کہ خالی اپیلوں سے کچھ کام نہیں بنتا اس کے لئے ضروری ہے کہ پوری طرح ملک کا تعاون اور ہمدردی حاصل کی جائے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اہل شہر کو یہ اعتماد نہ ہو کہ ارباب آب پوری محنت سے کام کر رہے ہیں، لہٰذا وہ ہر طرح کی ہمدردی اور تعاون کے مستحق ہیں۔

ایسے اعتماد کی جو گنجائش ہو سکتی ہے وہ کراچی کارپوریشن کے چیف افسر نے ختم کر دی ہے۔ جس پریس کانفرنس میں اسحاق صاحب نے زیر نظر بیان دیا اس میں آپ بھی موجود تھے۔ آپ نے یہ بتایا کہ کیسے بلدیہ گدھے گاڑیوں اور ٹرکوں کے ذریعے ان علاقوں تک پانی پہنچاتی ہے جہاں پانی کم ہے یا بالکل نہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا تھا گویا بلدیہ ایسا کر کے ان علاقوں کے محروم آب انسانوں پر احسان کرتی ہے۔ انہیں اور ان کے رفقائے بلدیہ کو اچھی طرح یہ جان لینا چاہیئے کہ اگر وہ اس قسم کا کوئی انتظام کرتے ہیں تو یہ ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے اور انہیں ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ وہ اس فریضہ کی بجا آوری میں کوتاہی کریں گے یا اسے بطریق احسن سرانجام نہیں دیں گے تو اسے انکی نا اہلی پر محمول کیا جائے گا۔ ضمناً چیف افسر صاحب نے یہ شکایت کی کہ بھشتی ان سے سستا پانی لے کر مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ یہ واقعی ایک گھناؤنا فعل ہے اور اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن یہ نتیجہ ہے خود بلدیہ کی نا اہلی کا۔ اگر بلدیہ اپنے فریضۂ منصبی کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کرے اور زیادہ سے زیادہ پانی مہیا کرے تو یہ بلیک مارکیٹ کی لعنت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ہم چیف افسر صاحب سے التماس کریں گے کہ وہ خدمت شہر کو اپنا اور بلدیہ کا شعار بنائیں اور خدمت کے زور پر اہل شہر کا تعاون اور ہمدردی حاصل کریں۔ اگر وہ اس طرح شہر کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی اور اہل شہر کی وہ شکایتیں جو باہمی بد اعتمادی سے پیدا ہوتی ہیں بالکل ختم ہو جائیں گی۔

ہماری ان گزارشات کا براہ راست روئے سخن تو منتظمین کراچی کی طرف ہے۔ لیکن در حقیقت ان کے مخاطب تمام مملکت پاکستان کے ارباب حل و عقد ہیں خواہ کسی صوبہ اور کسی شہر سے متعلق ہوں۔

آزاد عراق

عراق یوں تو ۱۹۳۲ء میں برطانوی انتداب کے خاتمہ پر آزاد ہو گیا تھا لیکن اس کے دورِ محکومی کی زنجیر کا ایک حلقہ ابھی تک ایسا باقی تھا جو اس کی مکمل آزادی کے لئے پا بہ زنجیر بنا ہوا تھا۔ برطانیہ اور عراق نے ۱۹۳۰ء میں ایک معاہدہ کیا تھا جو انتداب ختم ہونے پر ۱۹۳۲ء میں نافذ العمل ہوا۔ اس کی رو سے عراق کے دو ہوائی اڈے، حبانیہ اور شعیبہ برطانیہ کی تحویل میں آ گئے تھے۔ آجکل کی سیاست میں کسی ملک کے فوجی اڈوں کا کسی دوسرے (حلیف) ملک کے لئے کھلا رہنا محکومی یا زیردستی کی دلیل نہیں سمجھا جاتا۔ خود برطانیہ کے فوجی اڈے امریکہ کے پاس ہیں اور اس سے برطانیہ کی آزادی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن جو ملک پہلے کسی ملک کا محکوم رہ چکا ہو اس کے فوجی اڈوں پر اس کے سابقہ حاکم ملک کا عمل دخل، ایک نفسیاتی اثر ضرور رکھتا ہے۔ جس سے وہ آزاد شدہ ملک غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ ابھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے عراق کی دلی خواہش تھی کہ وہ عہدِ غلامی کی اس یادگار کو جلد از جلد مٹا سکے لیکن اس کے لئے اس نے شور اور واویلا مچانے کی بجائے، کوشش یہ کی کہ اسے بین الاقوامی سیاست میں ایسا مؤثر مقام حاصل ہو جائے جس کے پیشِ نظر برطانیہ از خود اس حلقۂ زنجیر کو توڑ کر الگ کر دے۔ یہ مقام اسے اس وقت حاصل ہوا جب اس نے ترکی سے معاہدۂ دفاع کیا اور اس میں یہ گنجائش رکھی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کی اساس بن سکے۔ اس معاہدہ میں برطانیہ کی شرکت نے ۱۹۳۰ء کے برطانوی عراقی معاہدے کو کالعدم بنا دیا۔ کیونکہ نئی صورتِ حال اس کی بجائے نئے دفاعی انتظام کی متقاضی تھی۔ چنانچہ ۲ ماہ کے شروع میں برطانیہ نے حبانیہ کا اڈہ خالی کر کے عراق کے حوالے کر دیا ہے۔ شعیبہ کا اڈہ عنقریب خالی کر دیا جائیگا۔ گویا عراق اب پوری طرح آزاد ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے متوقع دفاعی سلسلے کی بنیادی کڑی۔ ہم اس کامیابی پر عراق کو تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ آزادی ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے لئے نیک فال ثابت ہو۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ۔

۴۰۰ صفحات قیمت ۴ روپے

بین الاقوامی جائزہ

معاہداتِ پیرس کی تصدیق کی بدولت مغربی جرمنی آزاد ہو کر ناٹو کا رکن بن چکا ہے۔ اس طرح اس دفاعی تنظیم میں نئی جان پڑ جانے کی توقع پیدا ہو گئی ہے کیونکہ اب جرمن افواج بھی اس میں شریک ہو جائیں گی۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جسے روس لباسِ حقیقت سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اب اس نے حصولِ مقصد کے لئے نئی نئی چالیں چلنا شروع کر دی ہیں۔ اس نے بظاہر امن پسندی کے عملی ثبوت دینے شروع کر دیئے ہیں۔ وہ اقوامِ مغرب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتا ہے کہ روس مصالحت پر اتر آیا ہے۔ اور اس طرح انہیں اکساکر ان کی دفاعی تنظیموں کو معطل بنا دینا چاہتا ہے نیز اس سے وہ یہ فضا پیدا کر دینا چاہتا ہے کہ چونکہ روس آمادۂ صلح ہے لہٰذا اقوامِ مغرب کو چاہیئے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر امن کے راستے سے ہٹنے نہ دیں۔ اسی کا نتیجہ ہو گا کہ اقوامِ مغرب کے ہاں جب مشرق و مغرب کی کشیدگی کو کم کرنے پر گفتگو ہوتی ہے تو تان یہیں پر ٹوٹتی ہے کہ روس کو راضی کر لیا جائے اور اس کے مطالبات مان لئے جائیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو معاہداتِ پیرس کی تصدیق سے اقوامِ مغرب کی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے۔ انھوں نے اگر اس کا فائدہ نہ اٹھایا۔ اور روس کے معاملہ میں جرأت کا ثبوت نہ دیا۔ تو وہ مات کھا جائیں گی۔

آسٹریا سترہ سال سے غلام چلا آ رہا ہے۔ یہ سب سے پہلا ملک ہے جس پر ہٹلر کی فوجوں نے یلغار کی تھی۔ سات سال جرمنوں کی غلامی میں رہنے کے بعد دس سال سے یہ ملک دول اربعہ کے فوجی قبضے میں ہے۔ یوں تو اس کا معاہدہ ۱۹۴۹ء میں ہی تیار ہو گیا تھا لیکن روس نے ضد میں آ کر اسے ٹھکرا دیا۔ اب روس نے خود ہی اس معاہدہ کے لئے قدم اٹھایا۔ اور آسٹریا کے چانسلر کو ماسکو بلا کر اس سے غیر جانبدار رہنے کی ضمانت لے کر معاہدہ کی تفاصیل طے کر لیں۔ اس معاہدہ پر دوسری آنا میں امریکہ، برطانیہ، فرانس روس اور آسٹریا کے نمائندوں کے مابین ضروری مذاکرات ہو چکے ہیں۔ اور روس نے معمولی رد و کد کے بعد اقوامِ مغرب کی شرائط مان کر معاہدہ امن پر دستخط کر دیئے ہیں۔

اس معاہدے نے جو فضا پیدا کی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے روس کو دعوت دی ہے کہ وہ عالمی مسائل کے تصفیہ کے لئے اعلیٰ چار طاقتی کانفرنس میں شریک ہو۔ روس نے اس دعوت کو قبول بھی کر لیا ہے۔ اب تک کانفرنس کی مخالفت امریکہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب صدر آئزن ہاور نے اس کی منظوری دے دی ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اگر ایسی کانفرنس سے عالمی امن کی ہلکی سی امید بھی وابستہ کی جا سکتی ہے تو وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ خیال یہ ہے کہ صدر آئزن ہاور، وزیر اعظم ایڈن، وزیر اعظم فرانس اور وزیر اعظم مارشل بلگانن جولائی میں دو تین دن کی ملاقات کریں گے ان کے ساتھ وزرائے خارجہ بھی ہوں گے۔ اور وہی دراصل متعلقہ مسائل کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

روس نے اپنی سخت پالیسی کو تحدیدِ اسلحہ کے سلسلہ میں بھی نرم کیا ہے۔ لندن میں پانچ ممالک (امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور کینیڈا) کی جو کانفرنس گزشتہ تین ماہ سے تحدیدِ اسلحہ کے ذرائع پر غور و خوض کر رہی ہے۔ اس میں روس نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ اس کے سابقہ موقف سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اور ان میں مغربی مطالبات کو ماننے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً تحدیدِ افواج سے متعلق مغرب کی تجویز یہ تھی کہ امریکہ، روس اور چین کی فوجوں کی تعداد فرداً فرداً دس سے پندرہ لاکھ کے درمیان ہو۔ اور برطانیہ اور فرانس کی ساڑھے چھ لاکھ۔ روس آج تک اسے مسترد کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اب اس نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ اسی طرح مغرب کی تجویز تھی کہ ایٹمی اسلحہ کی تحدید و امتناع کا سلسلہ اس وقت شروع ہو جب غیر ایٹمی اسلحہ کی تحدید عمل میں پوری طرح لائی جا چکی ہو۔ روس کا مطالبہ یہ تھا کہ دونوں مراحل بیک وقت شروع ہوں۔ یا زیادہ سے زیادہ پچاس فی صدی تخفیف کے بعد۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روس اقوامِ مغرب کی ایٹمی برتری کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اب مفاہمت یہ ہوئی ہے کہ غیر ایٹمی اسلحہ پچھتر فیصدی کم ہو جائیں۔ تو ایٹمی اسلحہ کو ممنوع قرار دیدیا جائے۔

روس کی اس مفاہمت پسندی کے بعد تحدیدِ اسلحہ کے سلسلہ میں توجہات کا مرکز اقوامِ مغرب کی یہ تجویز ہو گئی ہے کہ جو ادارہ تحدید کی نگرانی کرے، اسے چند در چند اختیارات حاصل ہوں۔ مثلاً وہ بلا روک ٹوک تمام ممالک متعلقہ میں جا سکے۔ اسلحہ کے ذخیرے وغیرہ دیکھ سکے انہیں سفر کی پوری آسانیاں دی جائیں۔ وہ ہر طرح محفوظ ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ روس نے اس پر اپنی رائے کا اظہار ابھی نہیں کیا۔ اگر تحدیدِ اسلحہ کانفرنس واقعی کسی قابلِ عمل فارمولے پر متفق ہو گئی تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے روس کی یہ امن پسندی تبدیلیٔ قلب کی آئینہ دار نہیں بلکہ یہ طریقِ کار کی تبدیلی ہے۔ وہ اب اس کوشش میں مصروف ہے کہ اقوامِ مغرب کو امن کا سراب دکھا کر دفاعی تنظیموں کی عملی تشکیل سے روکے۔ اور ان کے حلیفوں کے دل میں غیر جانبداری کے خیالات پیدا کرے۔ جوں جوں غیر جانبداری کا حلقہ وسیع ہو گا اقوامِ مغرب کا اثر و دخل کم ہوتا جائے گا۔ اور روس کا اثر و نفوذ بڑھتا جائے گا۔ آسٹریا کو روس نے غیر جانبدار بنایا ہے۔ دراصل اس نے جرمنی کی خاطر یہ جال بچھایا ہے۔ اب مشرق و مغرب کی جو کانفرنسیں ہوں گی ان میں جرمنی کی وحدت کا مسئلہ خصوصیت سے سامنے آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ روس اس کے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

تاریخی شواہد

(۱۵)

قوانینِ خداوندی سے بغاوت اور اپنے سرکش و جابر ارباب حکومت کا اتباع - یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ (۱۱/۵۹)

یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اس کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی۔

بالآخر جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہو گئی اور سنت اللہ (قانون مکافات) کے مطابق ان کی غلط روش زندگی کے ظہور نتائج کا وقت قریب آ پہنچا تو آخری کوشش کے طور پر ان کی طرف انہی میں سے ایک رسول (حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۷/۶۵ نیز ۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ، ۲۳/۳۲)

اور (اسی طرح) ہم نے قوم عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے قوم! اللہ کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟

آپ آئے اور اُس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغام ازلی کی دعوت دی جو ہدایت آسمانی کی اصل و اساس ہے یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزاوار فقط ایک ذات باری تعالیٰ ہے

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۷/۶۵)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا، اُس نے کہا اے قوم! اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟"

سورۂ ہود میں ہے:

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ (۱۱/۵۰)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے قوم! اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (یعنی حاکم اور مالک نہیں اس کے سوا تم جو بھی عقیدہ رکھو، وہ باطل، گمراہ کن اور افترا کا خود ساختہ ہے۔

سورۂ احقاف میں ہے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۴۶/۲۱)

اور اے پیغمبر! (ذرا) قوم عاد کے بھائی بند (ہود) کے واقعات کو سامنے لاؤ جب اُس نے اپنی قوم کو مقام احقاف (صحرائے عرب) میں (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) ڈرایا اور (کچھ اسی پر منحصر نہیں) اُس سے پہلے اور اس کے بعد (اور بہت سے) ڈرانے والے (بھی) آچکے ہیں (وہاں تو) اس نے اپنی قوم سے کہا کہ محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کرو مگر صرف اللہ کی (کہ وہی تمہارا حاکم اور مالک ہے) اور (دیکھو) اگر تم اپنی غلط روش سے باز نہ آئے، تو) میں تمہارے متعلق ایک بڑے دن (یوم مکافات عمل) کے عذاب سے ڈرتا ہوں (کہ وہ تمہیں آکر گھیر لے)

قوم، قوت و سطوت کی مالک تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایت آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاویوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی عظیم الشان حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباع قوانین الٰہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝ (۱۱/۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو! تم قوانین الٰہیہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ یعنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کرو۔ وہ تم سب پر برستے ہوئے بادل بھیج دے گا (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جائیں گے) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھا دے گا (کہ روز بروز گھٹنے اور کمزور ہونے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے اور قوی ہوتے جاؤ گے) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اُس سے منہ نہ موڑو۔

یہ ہے عظیم الشان فرق آسمانی ہدایت اور ذہن انسانی کے پیدا کردہ تصور مذہبیت میں۔ ذہن انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ دین اور دُنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ دُنیا سے مُراد ہے قوت و سطوت، دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دین داری سے مفہوم ہے بے کسی و بے چارگی۔ عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی۔ یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے نفرت کی جائے اور ترک لذائذ سے پرہیزگاری کو مقصد حیات قرار دیا جائے۔ لیکن یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ دُنیا بھر کے سرکش متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعت مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دیدی جائے جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے۔ بلکہ قوانین خداوندی کے ماتحت نظم و ضبط عالم کو ترتیب دے۔ اور تمام نعمائے دنیا کو نوع انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عام کر دے۔ (تفصیل ان اشارات کی اپنے مقام پر آئے گی) حضرت ہودؑ نے یہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ نقط نظام معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اور اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہوگی کہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (۲۶/۱۲۵-۱۲۶ ، ۲۶/۱۳۱)

میں تو تمہارے لئے ایک امانت دار (خدا کا) پیغامبر ہوں۔ تو تم اللہ کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور اس کے لئے میری (یعنی ان احکام کی جو میں خدا کی طرف سے تمہیں پہنچا رہا ہوں) اطاعت کرو!

غور کیجئے۔ منصب رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں۔ بلکہ اس حکومتِ خداوندی کے مرکزِ اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۲۷ نیز ۱۱/۵۱)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف پروردگار عالم پر ہے (اور بس)

یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان، جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کس طرح اس نظام کو قبول کر لیں! سب سے پہلی تکذیب حسب معمول قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی۔ انہی سرداروں کی طرف سے جن کے گھروں میں ”برتن بھرے ہوئے تھے“۔

نوادرات - علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات، سرحدات پر متمدن ملکتوں کے وجود، عربوں میں یہودیت و نصرانیت کے فروغ اور عربوں کی قومی خصائل و امتیازات سے بحث کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ عربوں کا عقل کے اعتبار سے کیا مقام تھا۔ آج کی فرصت میں عربوں کے اس عقلی مقام سے متعلق ابن خلدون اور اولیری کی آراء پیش کی جا رہی ہیں۔

عربوں کی انفرادی حریت اس درجہ شدید تھی کہ وہ کسی قسم کی پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ کسی کے ماتحت ہو کر رہ سکتے تھے۔ ہر تسلط کے خلاف ان کی برافروختگی۔ جو ان کی حریت پر پابندی عاید کرتی ہو، خواہ وہ خود ان کی مصلحت کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ وہ راز کی کنجی ہے جو ہمارے لئے ان تمام جرائم اور خیانتوں کی تفسیر کر دیتی ہے۔ جو عربی تاریخ کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہے اس راز کو نہ جاننے کے سبب ہمارے عہد کی اکثر یورپین طاقتیں بڑی غلطیوں میں پڑ گئی ہیں۔ جس کے لئے انھیں بڑی قربانیاں دینی پڑیں اگر انھیں یہ راز معلوم ہوتا۔ تو وہ ان حماقتوں سے بچ سکتی تھیں عرب اقوام کی قیادت کی دشواریوں اور ان کا کسی قسم کے تسلط سے زیر نہ ہونا ہی وہ بڑا سبب ہے۔ جو ان کے لئے مغربی تہذیب کی راہ اختیار کرنے سے اب تک مانع رہا ہے۔ ایک عربی النسل آدمی اپنی حریت اور آزادی سے کس قدر والہانہ محبت کرتا ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جونہی کسی نے اس کی آزادی پر حد بندیاں لگائیں یا اس کی حریت کو کم کرنے کی کوشش کی تو وہ اس وحشی بھوکے شیر کی طرح برافروختہ ہو جاتا ہے جسے کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اور وہ پاگلوں کی طرح ان بندشوں کی شکست و ریخت اور دوبارہ اپنی آزادی کے حصول کے لئے پر جوش طریقہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک عربی شخص دوسری طرف اپنی قبائلی تقلیدات کا حد درجہ مخلص اور مطیع بھی ہو جاتا ہے۔ وہ سخی ہوتا ہے۔ مہمان نوازی کے واجبات اور جنگی معاہدات کو کما حقہ ادا کرتا ہے۔ دوستی کے فرائض و واجبات کو بھی وہ عرف عام کے مطابق نہایت خلوص کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر عرب میں یہ صفات و خصوصیات ایسی ہیں جو اسی قسم کے اجتماعی ارتقاء ہی کی عام صفات و خصوصیات شمار کی جا سکتی ہیں، نہ کہ کسی خاص قبیلہ کی خصوصی صفات۔ چنانچہ جب بھی عرب کسی مقام کے باشندے بن جائیں۔ مثلاً زرعی زندگی اختیار کر لیں۔ تو اس عقلیت میں ایک اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

۵ — اس کے علاوہ مصنفین کے اور بھی بہت سے اقوال ایسی لٹریری کتابوں میں موجود ہیں۔ جن میں وہ ہر فضیلت کو عربوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور ہر برائی کی ان سے نفی کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر آلوسی کا وہ بیان ملاحظہ کیجئے۔ جو بلوغ الارب میں درج کیا ہے۔ چنانچہ طویل گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ چونکہ عرب اقوام کا عقل و شعور سب لوگوں سے مکمل تر اور ان کی زبانیں سب سے شیریں تر اور ان کا فہم و ادراک وافر تھا۔ اس لئے ہر فضیلت ان میں پیدا ہوتی گئی۔ اور وہ ہر منقبت جلیلہ کے وارث بنتے چلے گئے[1]۔ نیز ابن رشیق نے "عمدہ" میں لکھا ہے کہ عرب لوگ تمام اقوام سے افضل ترین قوم تھے۔ اور ان کی حکمت تمام حکمتوں سے اشرف ترین حکمت تھی۔ الخ

مذکورہ بالا آراء کا اختلاف

ہم عربوں کی تقدیس کے معتقد نہیں ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اقوال ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جو ان کے شرف و فضل کے گن گاتے ہیں۔ اور ہر کمال سے انھیں متصف اور ہر نقص سے انھیں منزہ قرار دیدیں۔ کیونکہ اس قسم کے اقوال ایک علمی بحث کا مرکز نہیں بن سکتے۔ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ عرب بھی ایک قوم ہیں۔ جیسے دنیا کی اور بہت سی قومیں ہیں۔ ان کے اپنے کچھ خصائص و امتیازات ہیں جب کہ ان میں کچھ عیوب بھی ہیں، ان کی عقلیت، لغویت، آداب، تاریخ غرضکہ ان کی ہر چیز ہر قسم کی علمی تنقید کے تحت لائی جا سکتی ہے جیسا کہ دوسری قوموں کی یہ تمام چیزیں علمی تنقید کا نشانہ بن سکتی ہیں لہٰذا وہ قول جس کا نمونہ پانچویں رائے نے پیش کیا ہے کسی قسم کی بحث و نزاع کا مستحق نہیں بن سکتا۔ اسی طرح علمائے شعوبین یعنی علمائے عمرانیات کی پہلی رائے — تو ان حضرات نے بھی غلطی کی ہے۔ جو عربوں سے یونانی فلسفہ کی طرح ایک فلسفہ کے متوقع ہیں۔ اور رومی قانون کی طرح ایک قانون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں دیباج جیسی صنعتوں میں ماہر ہونا چاہئے تھا۔ یا اصطرلاب جیسی اختراعات کرنی چاہئے تھیں۔ کیونکہ اگر وہ ان قوموں کا مقابلہ جاہلی عربوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو یہ مقابلہ نہایت ہی غلط ہے۔ مختلف قوموں میں مقابلہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ تہذیب و تمدن کے ایک ہی مرتبہ پر فائز ہوں۔ ایک ایسی قوم میں جو تمدن کی پہلی سیڑھی پر اپنا پہلا قدم رکھ رہی ہو۔ اور ایک ایسی قوم میں جو پوری طرح متمدن ہو چکی ہو۔ قطعاً کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس قسم کا مقابلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک آدمی کی بچپن کی عقل اور زمانہ کہولت کی عقل میں مقابلہ کیا جائے۔ یہ تمام اقوام یعنی ایرانی اور رومی بھی بدوی زندگی کے دور سے گذر چکی ہیں۔ جب کہ ان کا کوئی فلسفہ تھا اور نہ کوئی اختراعات تھیں۔ البتہ اگر عرب اقوام کا مقابلہ ان اقوام کے ساتھ اس دور میں کیا جائے۔ جب کہ وہ تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی تھی۔ تو کون انکار کر سکتا ہے کہ عربوں کے پاس قانون بھی تھا۔ اور اپنا ایک علم بھی تھا۔ اگرچہ وہ تھوڑا ہی سا تھا — جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے — لہٰذا بحث و نزاع صرف ان دو رایوں میں کی جا سکتی ہے۔ جیسے ابن خلدون اور اولیری نے پیش کیا ہے۔

ابن خلدون کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی قوم ایک وحشی قوم ہے۔ لوٹ مار کرنے والی قوم۔ جب کسی مملکت کو وہ اپنا تابع فرمان کر لیتی ہے۔ تو وہ مملکت بہت جلد برباد ہو جاتی ہے۔ کسی رئیس کی اطاعت کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے۔ نہ وہ کسی قسم کی صنعت عمدگی سے چلا سکتی ہے۔ اور نہ ہی علمی میدان میں کوئی خوبی پیدا کر سکتی ہے۔ اور نہ ہی اس قوم میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ صنعتی اور علمی میدانوں میں عمدگی کے ساتھ کوئی کام انجام دے سکے۔ البتہ اس قوم کی طبائع سلیم ہیں جو خیر کے لئے مستعد ہوتی ہیں اور فطری طور پر یہ لوگ بہادر اور شجاع ہوتے ہیں۔

اولیری کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی قوم ایک مادی قوم ہے جس کے خیالات تنگ اور جذبات جامد ہوتے ہیں۔ اسے اپنی عزت و حریت کا احساس نہایت شدومد سے ہوتا ہے۔ کسی قسم کا تسلط اور تغلب برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ سخی ہوتے ہیں اور قبائلی تقلیدات کے بہت مخلص ہوتے ہیں۔

یہ دونوں حضرات عربوں کے ان دو اوصاف میں متفق ہیں کہ عرب قوم ایک مادی قوم ہے۔ اور نیز یہ کہ کسی قسم کا تسلط برداشت نہیں کر سکتی۔ دوسرے وصف میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے اولیری نے بالکل سچ کہا ہے کہ "یہی وہ صفت ہے جو ان تمام جرائم اور خیانتوں کی ہمارے لئے تشریح کر دیتی ہے جو تاریخ عرب کے ایک بہت بڑے حصہ پر حاوی ہیں"۔ رہ گئی عربوں کی مادیت، تو اکثر مستشرقین نے ابن خلدون اور اولیری کی تائید کی ہے کہ عربوں میں مادیت کا وصف موجود تھا۔ چنانچہ استاد براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ الادب عند الفرس" میں بھی یہی لکھا ہے۔ اس صفت سے ان لوگوں کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک صرف مادہ کی ہی قدر و قیمت ہے۔ یعنی وہ روپیہ پیسہ ہی کی قدر و قیمت جانتے ہیں، وہ گئی معنوی چیزیں تو ان کی نگاہوں میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ یہ وصف آج بھی بعض بادیہ نشین عربوں میں کھلا کھلا تمہیں نظر آ جائے گا۔ لیکن کیا یہ ایسا وصف ہے جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں عام طور سے پایا جاتا ہو؟ اس میں ہمیں شک ہے۔ سخاوت اور وفا کی جو حکایات لٹریری کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں۔ اگر وہ صحیح ہیں نیز قبائلی تقلیدات کی حفاظت میں جب سے ہنستے کھیلتے اپنی جانوں کو قربان کر دینا اگر قابل اعتماد ہو۔ تو یہ چیزیں مادیت کے قطعاً منافی ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ عربوں کا وصف بیان کرنے میں ابن خلدون اور اولیری دونوں ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کا عربی شخص زمانۂ اسلام کے عربی شخص سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ بلکہ جاہلیت کے زمانہ کا بھی عربی شخص اگر متمدن ہوتا تھا تو وہ بادیہ نشین سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ آج کل کے بادیہ نشین عرب بہت سی باتوں میں زمانۂ جاہلیت کے بادیہ نشینوں سے قطعاً مختلف ہیں۔

اسلامی معاشرت

صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

[1] بلوغ الارب صہ ۱۴۴ ج ۱

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید)

تمہید کے ابتدائی اشعار میں اقبالؔ نے بتایا ہے کہ بصیرتِ قرآنی سے اس کی نگاہوں میں وہ وسعت اور گہرائی پیدا ہو چکی ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رموز و اسرار کو بے نقاب دیکھ رہا ہے! اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ چونکہ مجھے حقائقِ کائنات بیان کرنے ہیں اس لئے میں نے آرٹ کی اس بساط کو الٹ دیا ہے جس کا مقصد قوم کو زندگی کی سطحی رنگینیوں میں الجھائے رکھنا تھا۔

محفلِ رامش گری برہم زدم
زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم

میری نوائے انقلاب نے رقص و سرود کی ان کہنہ محفلوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ میں بربط و سرود کے تاروں کے بجائے، خود رگِ کائنات کو چھیڑتا ہوں اور میری مضراب اس میں پوشیدہ نغموں کو فضائے عالم میں مشہود کرتی ہے۔ لیکن یہی میری مشکل بھی ہے۔ میرے ہم جلیس (جن کے کان انہیں پرانے نغموں کے خوگر ہو چکے ہیں) اس موسیقیٔ جدیدہ سے یکسر ناآشنا ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

بسکہ عودِ فطرتم نادر نواست	هم نشیں از نغمہ ام ناآشناست

چونکہ میری فطرت کا ساز بالکل نادر اور "اچھوتے" نغمے پیدا کرتا ہے۔ اس لئے میرے ہم صفیر اور ہم نشین حیران ہیں کہ میں کس دیس کی بولی بول رہا ہوں۔ ان حالات کے ماتحت، میری حالت یہ ہے کہ

در جہاں خورشیدِ نو زائیدہ ام	رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

میں دنیا میں ایک آفتابِ تازہ ہوں جسے بطنِ گیتی ابھی ابھی منصۂ شہود پر لائی ہے۔ میں ابھی اس آسمان کے قواعد و ضوابط اور آئین و رسوم سے واقف نہیں ہوں۔

هم ندیده انجم از تابم ہنوز	ہست ناآشفتہ سیمابم ہنوز

اس آسمان کے ستارے میری حرارت سامانیوں سے متاثر ہو کر مائل بہ حرکت نہیں ہوئے۔ ابھی میرا سیماب (کہ جس کی فطرت میں بے تابی ہوتی ہے) متحرک نہیں بلکہ جامد ہے۔ میں جس بستی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے آیا ہوں وہاں کے رہنے والے خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں اور ان میں زندگی اور حرکت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔

بحر از رقصِ ضیایم بے نصیب	کوہ از رنگِ حنایم بے نصیب

جب سورج چڑھتا ہے تو اس کی پہلی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچتی ہیں اور ان کا دو پہلی عکس ہر دیدۂ بینا کو مستنیر کرتا ہے لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں طلوع ہو چکا ہوں۔ لیکن عصرِ حاضر کا سمندر میری شعاعِ فکر کے رقص سے یکسر ناآشنا ہے۔

جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی لالہ گوں سرخی پہاڑ کی چوٹیوں کو حنا آلود بنا دیتی ہے۔ شفق کی رنگینی تمام بلندیوں پر پھیل جاتی ہے۔ لیکن میری حالت یہ ہے کہ میرے زمانہ کی بلندیاں میری رنگینیٔ فکر سے یکسر محروم ہیں۔ میرے ہم عصروں کو پتہ ہی نہیں کہ میں ان کے لئے کس قسم کی تابندگی و درخشندگی کے سامان لے کر آیا ہوں۔

خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود	لرزہ بر تن خیزدم از بیمِ نمود

اس دنیا کی آنکھ ابھی مجھ سے بالکل ناآشنا ہے اس لئے اس خیال سے کہ میں اس ناآشنا دنیا کے سامنے کس طرح آؤں، میرے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

بامم از خاور رسید و شب شکست	شبنمِ نو بر گلِ عالم نشست

انتظارِ صبح خیزاں می کشم	اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

عام قاعدہ ہے کہ جب رات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور صبح کا سپیدہ نمودار ہونے کو آتا ہے تو صبح کے وقت اٹھنے والے از خود بیدار ہو جاتے ہیں اور آفتاب کی نور پاشیوں سے متمتع ہونے لگ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ رات کبھی کی ختم ہو چکی ہے اور میری صبح کب سے نمودار ہو چکی ہے۔ اور کب سے گل ہائے کائنات، نئی شبنم کے قطروں سے اپنے منہ دھو چکے ہیں لیکن میں ابھی تک صبح کے وقت اٹھنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ یعنی میں تو روشنی اور بصیرت کے پورے سامان اپنے ساتھ لے کر آ چکا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی آنکھ ایسی نظر نہیں آتی جو اس روشنی سے متمتع ہو سکے۔ میرے سوزِ قلب کی آگ مدت سے روشن ہے۔ لیکن اس آگ کا پرستار ابھی تک کوئی نہیں پیدا ہوا۔

کس قدر خوش بخت ہوں گے وہ لوگ جو اس آگ کی حرارت سے اپنے سینہ کو آتشکدہ بنا لیں حقیقت یہ ہے کہ میں وہ نغمہ نہیں جو بربط کے تاروں کے اندر خاموش پڑا بیٹھا ہو اور جب تک کسی مضراب زن کی انگلیاں ان تاروں کو نہ چھیڑیں، وہ ساز کے پردوں سے باہر ہی نہ آئے۔ میں وہ نغمہ ہوں جو بلامنتِ مضراب فضا کو مرتعش کرتا چلا جاتا ہے۔ میری نوائے شوق کو ساز و سامان کی ضرورت ہی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں قبل از وقت اس محفل میں آ گیا ہوں۔ میری بات میرے ہم عصر نہیں، بلکہ بعد میں آنے والے سمجھ سکیں گے۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم	من نوائے شاعرِ فرداستم

اس لئے کہ

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست	یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

جس زمانہ میں میں پیدا ہوا ہوں یہ حقائقِ کائنات سے بالکل بے بہرہ ہے۔ میرا یوسفِ فکر اس بازار کے لئے تھا ہی نہیں۔ اس کے خریدار کسی اور بازار میں ملیں گے۔

ناامیدستم ز یارانِ قدیم	طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

میں ان یارانِ قدیم سے ناامید ہوں۔ ان کی عمریں، جمود و تعطل میں گزری ہیں۔ ان کے لئے فکر و عمل کی دنیا میں ادنیٰ سا تغیر پیدا کرنا بھی محال ہے۔ اور میں اس ساری بساط کے الٹنے اور بالکل بساطِ جدید بچھانے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس لئے مجھے ان شاعرانِ کہنہ سے کیا امید ہو سکتی ہے؟ ایک زمانہ وہ تھا کہ طور پر آگ کی پہلی چمک دکھائی دی اور وہاں کلیم آ موجود ہوا۔ اور ایک یہ میرا زمانہ ہے کہ میرے سینہ کا طور اس کلیم کے لئے آتش بداماں ہے جو ہنوز پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اس انتظار میں جل رہا ہے کہ کبھی نہ کبھی، کوئی کلیم تو آئے ہی گا۔

اقبالؔ کو پہلے دن سے اس کا احساس تھا کہ اس کا پیغام قبل از وقت ہے۔ اس کا زمانہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انقلاب آفریں پیغام اپنے زمانہ سے پہلے آیا کرتا ہے۔ پیغام دینے والا (عام دنیاوی معیاروں کے مطابق) ناکام چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا پیغام ایک تخمِ صالح کی طرح زمین گیر ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک شجرِ طیب کی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا چلا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ انقلاب، حقائقِ عالم کی صحیح بنیادوں پر استوار ہو اور اس کا مقصود نوعِ انسانی کی منفعت بخشی ہو۔ اقبالؔ نے اپنی تنہائی کا جو شکوہ پہلے دن کیا تھا اسے وہ تمام عمر دہراتا رہا۔ اور مرتے وقت بھی یہ کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوا کہ

چوں رخت خویش بربستم ازیں خاک	ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر	چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

لیکن اسے اس کا احساس (بلکہ یقین تھا) کہ اس کے پیغام کا یہ تخمِ صالح، برگ و بار لائے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبالؔ پر اپنی قسم کی پہلی کتاب

اقبال اور قرآن

از پرویزؔ

عورت قرآن کا

—(۱۳)—

(۴) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ
بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ　　　　(بقرہ رکوع ۲۱)

اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کردی ہیں وہ تو صرف یہ ہیں کہ " مُردار جانور، خون، سور کا گوشت، اور وہ جو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے نامزد کیا گیا ہو۔ بس۔ اب اگر ایسی حالت پیش آجائے کہ کوئی آدمی بھوک سے بیتاب ہو اور مقصود نہ تو لذت ہو اور نہ خدائی حدود کو توڑنا، تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں۔ اگر وہ یہ چیزیں بھی کھالے اللہ ہی بڑا سامان حفاظت و پرورش بخشنے والا ہے۔

(۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ　　　　(مائدہ ع ۱۲)

اے مسلمانو! خدا نے جو چیزیں تم پر حلال کردی ہیں۔ انہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو۔ اور (روک ٹوک میں) حد سے نہ گزرو۔ اللہ حد سے گزرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۶) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ
لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ وَاِنَّ كَثِيْرًا
لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ
(انعام ع ۱۴)

اور تم کو کون سا امر اس کا باعث ہوسکتا ہے کہ تم اُس جانور کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ تم پر جو کچھ حرام کیا گیا ہے وہ اللہ نے تم کو تفصیلاً بتلا دیا ہے۔ مگر وہ بھی، مجبوری کی حالت میں، تمہارے لئے حلال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ، بلا کسی سند کے محض اپنے غلط خیالات کی بنا پر لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ تمہارا پروردگار انہیں خوب اچھی طرح جانتا ہے جو حد سے نکل جانے والے ہیں۔

(۷) قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ
اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ
فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
(انعام رکوع ۱۸)

تم کہدو کہ جو وحی، میرے پاس بھیجی گئی ہے، میں اُس میں تو کوئی حرام چیز نہیں پاتا کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو، بجز اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں بلاشبہ گندی ہیں، یا پھر جو چیز گناہ کا موجب ہو، وہ، وہ ہے جو غیر اللہ سے نامزد کیا گیا ہو۔ پھر اگر کوئی شخص بیتاب ہو اور مقصود لذت یا نافرمانی نہ ہو تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار ہی حفاظت و پرورش کا سامان عطا کرنے والا ہے "

---

(۶)

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ
اَفْوَاجًا وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا وَّسُيِّرَتِ
الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا　　　　(النبأ رکوع ۱)

بیشک فیصلے کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ دن جس دن بگل پھونکا جائے گا۔ پھر تم لوگ گروہ در گروہ ہو ہو کر آؤگے۔ اور بلندیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ چنانچہ ان میں دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے اور پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہو جائیں گے

(۲) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ
اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ وَاَشْرَقَتِ
الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ
مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ　　　　(زمر رکوع ۷)

اور بگل پھونکا جائے گا سو تمام بلندیوں اور پستیوں والوں کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ الا یہ کہ جس کو خدا چاہے پھر دوبارہ بگل پھونکا جائے گا تو دفعتاً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے، دیکھنے لگیں گے اور زمین خدا کے نور سے روشن ہو جائے گی اور خدا کا قانون قائم کر دیا جائے گا۔ اور پیغمبر اور گواہ سب حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے"

—(۷)—

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ
اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ　(فاطر ع ۴)

جو لوگ اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے رہتے ہیں اور نظام صلوٰۃ کو قائم رکھتے ہیں اور جو ہماری دی ہوئی دولت کو مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ پوشیدہ طور پر بھی اور علانیہ طور پر بھی وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی بھی ماند نہ پڑے گی تاکہ وہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج پورے پورے دیدے ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ بھی دے۔ بیشک وہی مخالف طاقتوں سے حفاظت کا سامان اور پرورش و آسائش کے لئے ربوبیت کے سامان بخشنے والا ہے۔

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ
عَمَلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ
يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا
خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ
نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا　　　　(کہف رکوع ۴)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے صلاحیت بخش کام کئے تو ہم ایسوں کا ...... کا اجر ضائع نہ کریں گے جو معاشرہ میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے والے کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے وہ سدا بہار باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ لوگ سبز رنگ کے باریک اور دبیز ریشم کے کپڑے پہنیں گے اور وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ واقعی یہ کیا ہی اچھا صلہ اور کیا ہی اچھی جگہ ہے؟

اسلام کا نظام معاشرت کیا ہے؟
اور وہ کیسے متشکل ہوسکتا ہے؟
اس کا جواب
نظام ربوبیت میں ملاحظہ کیجئے۔

سب سے پہلے اور سب سے بڑے مفسر

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری

(از علامہ تمنا عمادی مدظلہ)

۲

مجھے تو یقین ہے کہ شیعہ حضرات نے جب سیاسی طاقت پیدا کی اور اپنے مذہب کی الگ تدوین شروع کر دی اور اپنی حدیث و تفسیر وغیرہ کی کتابیں بھی الگ کر لیں، اور ان کا حصۂ رسدی جو اہل سنت کی کتابوں میں رہ گیا تھا یعنی ان کی حدیثیں جو اہل سنت نے اپنی کتابوں میں صرف اس لئے درج کر لی تھیں کہ الگ الگ دو فرقے نہ ہو جائیں اور ان کی دلجوئی بھی ہوتی رہے۔ وہ ساری کی ساری حدیثیں اہل سنت کے سر پڑ گئیں۔ جن کے متعلق اب شیعہ حضرات کہا کرتے ہیں کہ تمہاری کتابوں میں بھی تو فلاں فلاں روایتیں موجود ہیں۔ حالانکہ وہ خود انہی کی دی ہوئی حدیثیں ہیں۔ ورنہ وہ بتائیں کہ جب بخاری و مسلم مدون ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کی کون سی کتاب تھی؟ یہاں تک کہ مستدرک حاکم جو خاص شیعہ کی کتاب ہے اور صاحب مستدرک بالاتفاق شیعہ تھے۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا ترجمہ لکھتے ہوئے لکھا ہے "رافضی خبیث" "کان شدید التعصب فی التشیع فی الباطن وکان یظہر التسنن فی التقدیم والخلافۃ" یعنی ابو عبداللہ الحاکم صاحب مستدرک رافضی تھے، شیعیت کے تعصب میں باطن بہت سخت تھے اور سنی ہونا ظاہر کرتے تھے۔ شیخین کو مقدم ظاہر کر کے اور خلافت کا اقرار کر کے، الخ مگر یہ بھی اپنی کتاب مستدرک کے ساتھ اہل سنت ہی کے سر ہے۔ بعض شیعہ راویان حدیث کے نام ہی بدل گئے۔ کہیں حروف کا فرق کہیں نقطوں کا فرق۔ کہیں نسبت کا فرق، کہیں ولدیت کا فرق پیدا کر دیا۔ اور کتنے شیعہ راویان حدیث سے شیعوں نے انکار کیا کہ وہ ہمارا راوی ہی نہیں۔ اس لئے کہ ابان کو ان سے کوئی کام تو رہا نہیں۔ وہ تو ان کا کام کر گئے کہ ان کتابوں میں جو اہل سنت کے سر پڑ گئی ہیں شیعوں کی حمایت میں حدیثیں بھر گئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو بھی ایک سے دو کر دیا گیا۔ اور صرف دادا کے نام کا فرق پیدا کر کے سنیوں کو یہ دھوکا دیا گیا کہ ہمارا ابو جعفر طبری تو ابن جریر رستم ہے اور وہ جو مفسر و مؤرخ ہے۔ وہ ابن جریر بن یزید ہے اور وہ تمہارا ہے۔ ہم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں اس میں شیعوں کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا۔ کہ ابن جریر کی تفسیر و تاریخ میں جو روایتیں شیعوں کے موافق ہیں وہ سنیوں کے خلاف سنیوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں کہ دیکھو تمہارے مفسر اور تمہارے مؤرخ ایسا لکھ رہے ہیں۔ مگر یہ الزام اور اس طرح کی ترکیبیں جب کی گئیں کہ اہل سنت ان چیزوں کو اپنے گلے لگا چکے، اس لئے حقیقت حال یہی ہے کہ دونوں ابن جریر ایک ہی ہیں ہرگز دو نہیں اور بفرض محال دو ہوں بھی تو عین وغین کی صورت ایک ہی ہے اس لئے بہرحال دونوں ایک ہی ہیں۔

ابن جریر مفسر کے شیوخ ابن جریر مفسر کے شیوخ تو بہت ہیں مگر کیسے کیسے شیوخ ہیں ان کو وہی خوب جانتے ہیں جنھوں نے کتب رجال کی کافی سیر کی ہو اسی لئے امام حجر و امام ذہبی نے ان کے محض چند ہی شیوخ کے نام گنائے ہیں۔ جن میں محمد بن عبدالملک البصری متوفی سنہ ۲۴۴ھ۔ فلاس متوفی سنہ ۲۴۹ھ۔ یعنی عمرو بن علی البصری۔ اسحاق بن ابی اسرائیل المروزی ثم البغدادی متوفی سنہ ۲۴۰ھ، ہناد بن السری الکوفی متوفی سنہ ۲۴۳ھ۔ ابو کریب محمد بن العلاء الکوفی الہمدانی متوفی سنہ ۲۴۳ھ اور ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ البصری متوفی سنہ ۲۵۰ھ یا سنہ ۲۵۱ھ یا سنہ ۲۵۲ھ (باختلاف اقوال) ایسے ہیں جن کو ائمہ حدیث و رجال ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن سے صحاح میں روایتیں ہیں۔ ان لوگوں کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی دو بصری ہی ہیں یا ایک صاحب مرو کے رہنے والے عجمی ہیں جو بغداد میں آ بسے تھے۔ لیکن فلاس اور محمد بن عبدالملک دو بصریوں کے سوا کسی کے ترجمے میں فہرست تلامذہ جہاں لکھی ہے وہاں ابن جریر طبری کا نام نہیں لکھا ہے مگر ابن جریر کے ترجمہ میں ابن جریر کے شیوخ میں ان سب حضرات کے اسمائے گرامی ضرور ملتے ہیں۔ بہرحال ابن جریر طبری کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے اور وفات سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی، اس لئے مذکورہ بالا اساتذہ میں سے صرف ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ ہی کا وقت یہ ایک حد تک پا سکے، اس لئے کہ ابو موسیٰ کی وفات کے وقت ان کی عمر چھبیس۲۶ یا ستائیس۲۷ یا اٹھائیس۲۸ برس کی تھی۔ باقی لوگوں میں سے فلاس کی وفات کے وقت بھی یہ پچیس۲۵ سال کے ٹھہرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ تو کسی کی وفات کے وقت سولہ برس کے۔ کسی کی وفات کے وقت اٹھارہ۱۸ یا انیس۱۹ برس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان ثقہ حضرات سے روایتیں لینے کا فی الحقیقت موقع ہی کم ملا۔ اگرچہ ابو کریب سے یہ بہت روایت کیا کرتے ہیں۔ مگر ابو کریب کی وفات کے وقت یہ ہرگز انیس سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ اور ابو کریب تو کوفی بھی تھے اور ہمدانی بھی۔

محمد بن حمید حبان الرازی ابن جریر کے شیوخ میں ان کا نام لکھا ہے۔ ان کے متعلق امام بخاری کہتے ہیں۔ فیہ نظر۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں۔ ان سے پاس منکر روایتیں بہت ہیں۔ امام نسائی نے کہا کہ غیر ثقہ ہیں۔ علامہ جوزجانی نے کہا کہ ردی المذہب ہیں غیر ثقہ ہیں۔ صالح بن محمد الاسدی مشہور محدث فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالےٰ کے سامنے اس قدر ڈھیٹ کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ دوسروں کی حدیثوں کو لے لیا کرتے تھے اور ان میں الٹ پلٹ کر لیا کرتے تھے یہ بھی کہا کہ مشاق جھوٹا دو آدمیوں جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ ایک تو سلیمان الشاذکونی دوسرے محمد بن حمید امام ابو زرعہ نے اپنے بھتیجے سے ان کے متعلق کہا کہ یہ قصداً جھوٹی روایت کرتے تھے اور متعدد ائمہ رجال و حدیث نے ان کو کذاب کہا۔ تفصیل لسان المیزان و میزان الاعتدال میں طوالت کے ساتھ موجود ہے۔

اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری ابو محمد یا ابو اسحاق الکوفی۔ یہ بھی ابن جریر کے مذکورہ اساتذۂ خصوصی میں سے ہیں۔ ان کو لوگوں نے اسمٰعیل بن ابی کریمۃ السدی مشہور مفسر مگر غالی شیعہ اور معروف کذاب اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمۃ السدی کا نواسہ لکھا ہے جیسا کہ امام بخاری و امام مسلم و امام نسائی و ابن سعد وغیرہم نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور ابو علی جیانی نے ان کو سدی کا بھانجا لکھا ہے۔ مگر ان کو بقول ابو حاتم۔ سدی کی قرابت قریبہ سے انکار تھا بہرحال سدی ہی کی طرح بالاتفاق ان کو بھی سب نے شیعہ ہی تسلیم کیا ہے۔ مگر کوئی غالی شیعہ لکھا ہے، کوئی غالی شیعہ۔ ابو بکر بن ابی شیبہ اور ہناد بن سری اس کو فاسق کہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اس سلف کو گالیاں دینے والے سے لوگ کیا حدیثیں لیتے ہیں، یہ شریک بن عبداللہ الکوفی جو تشیع مفرط میں مشہور تھے ان کے شاگرد تھے۔ مگر ان سے بھی ایسی روایت کیا کرتے تھے۔ جو کوئی دوسرا ان کا شاگرد نہیں جانتا تھا

عباد بن یعقوب الاسدی الکوفی۔ نہایت غالی شیعہ تھے۔ شریک بن عبداللہ الکوفی کے شاگرد رشید تھے۔ انھیں سے یہ روایت ہے کہ "میرے منبر پر معاویہ کو دیکھو تو اس کو قتل کر دو۔" اس قسم کے قول کا بہتان یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھتے تھے حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی شان میں کرے الفاظ بولتے تھے، اور مناقب حضرت علی و حضرت فاطمہ و حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم میں جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے ۲۵۰ھ میں وفات پائی۔

اور جن اساتذہ ابن جریر کا نام ابن حجر وغیرہ نے نہیں لکھا ہے۔ وہ تو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں اس مختصر سی تحریر میں کہاں تک لکھا جائے۔ اہل حق کو چاہیئے کہ تفسیر ابن جریر کو دیکھیں تو رجال کی کافی چھان بین کے بعد قرآنی سیاق و سباق سے ملاتے ہوئے تفسیری روایتوں کو دیکھیں اور ہرگز ہرگز کسی تفسیری روایت پر بلا تحقیق یقین نہ کر لیں۔ یہ واقعہ ہے کہ تفسیری روایات میں اسی فیصدی روایات محض کذب و افترا ہیں میرا یہ دعویٰ محض قیاسی یا تعصب یا بدگمانی پر مبنی نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے نہایت واضح دلائل موجود ہیں اور میں اپنے دعویٰ پر شہادتیں لکھتا ہوں۔ مثلاً ابن جریر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں (بصفحہ ۲۱ مطبوعہ مصر) ایک روایت لکھی ہے جس کو یوں شروع کیا گیا ہے حدثنی سعید بن الربیع مگر "سعید بن الربیع"

سلہ مثلاً مندل رجال ابناالبی العنزی کو کتب رجال شیعہ اور کتب رجال اہل سنت میں ان کے حالات دیکھیے۔ شیعوں نے مندل کو جو وزن سے ہے "مبدل" بائے موحدہ تحتانیہ سے اور عنزی کو جو نون اور زائے معجمہ سے ہے عنری تائے قرشت اور رائے مہملہ سے بدل دیا اسی طرح مندل کے بھائی حبان العنزی جو بائے موحدہ سے ہے اس کو یائے مثناۃ سے بدل دیا مگر یہاں عنزی کو علی حالہ رہنے دیا۔ کہ دونوں اپنے بھائی نہ سمجھے جائیں اسی طرح یزید بن معاویہ الکوفی شیعوں کا ایک بہت بڑا محدث تھا اس کو وہ پہلے تو پیدا نہیں سمجھتے تھے۔ متقدمین شیعہ کا نام یزید اور معاویہ ہوتا تھا جاڑے کے لیے تعصب بڑھا۔ تو یزید کو بزید بائے موحدہ اور رائے مہملہ سے بنا دیا۔ چونکہ اس سے کچھ روایتیں ان کتابوں میں بھی ہیں جو اہل سنت کی کہی جاتی ہیں۔ ورنہ یزید اور معاویہ نام کے راویان حدیث ان کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں مگر ان سے اہل سنت کے سر منڈھی ہوئی کتابوں میں چونکہ کوئی روایت نہیں تھی اس لئے ان لوگوں کے نام نہیں بدلے اور اسطرح کی تبدیلی و تحریف کی مثال شیعوں کے یہاں بہت ملیں گی اگر اس کی جستجو میں وقت صرف کیا جائے۔

سلہ مجھ کو ...... ہے تو اکثر لوگ واقف ہیں کیونکہ کوفہ شیعوں کا خاص مرکز تھا اور ہمدانیوں کے حالات میں متعدد احادیث نزول ہیں ..... کے حق میں .... کو بھائی بھی شیعہ کا ایک مستقل گروہ تھا۔ اور اب دیکھیے کہ ابو کریب سے شیعوں کے موافق بہت حدیثیں ملیں گی خاص حدیث کساء کے

صرف ایک ہی راوی حدیث تھے جن کا پورا نام سعید بن الربیع الحرشی العامری البصری ہے۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ میں حافظ ابن حجر نے ان کو اقدم شیخ البخاری لکھا ہے یعنی یا امام بخاری کے سب سے قدیم ترین شیخ تھے۔ ان کی سال وفات ۲۱۱ھ دو سو گیارہ امام بخاری کی روایت سے لکھا ہے یعنی ابن جریر طبری کی ولادت سے تیرہ برس پہلے۔ کیونکہ ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی اور کوئی دوسرا راوی حدیث اس نام اور اس ولدیت کا کہیں ہے نہیں۔ تو پھر یہ حدثنی سعید بن الربیع کہہ کر ابن جریر کا کوئی حدیث روایت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ بات خود بناتے تھے اور سلسلۂ اسناد صحیح بخاری سے مستعار لے لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی اشاعت تو امام بخاری کی خواہش سے بھی زیادہ ان کے ان شاگردوں نے کی، جنہوں نے اس کی متعدد نقلیں کر کے حسب قدر حسب گنجائش تحریفوں کے بعد ان ملکوں تک ان نسخوں کو پہنچایا جن ملکوں تک امام بخاری نہ جا سکے تھے اور ان لوگوں تک پہنچایا جو نہ امام بخاری کے پاس آئے نہ امام بخاری ان کے پاس پہنچے۔ مثلاً ابوجعفر ابن جریر الطبری کہ امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ابن جریر کی عمر ۳۲ برس کی تھی۔ امام بخاری خود عجمی تھے ان کے علم و فضل کا کافی شہرہ عجمی ملکوں میں ہو چکا تھا۔ اور وہ جس قدر علم کے حریص تھے، سب کو معلوم ہے۔ اگر امام بخاری کے دل میں کچھ بھی ابن جریر کی جگہ ہوتی۔ تو وہ ضرور ابن جریر کے پاس پہنچتے۔ اور ان سے بھی حدیثیں لیتے اور ابن جریر اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ امام بخاری کے تلامذہ کی صف میں داخل ہوتے۔ مگر صحیح بخاری سامنے رکھ کر اس سے اسناد و حسب ردوبدل کے ساتھ یا بجنسہ لے کر اپنی من گھڑت حدیثوں پر چسپاں کر دیا کرتے تھے لیکن امام بخاری کی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط و تاریخ صغیر کی تو اشاعت ہوئی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط نہیں ملتی ہے۔ اس لئے امام بخاری کے کون شیخ کب وفات پا گئے۔ اس کی خبر ابن جریر کو پوری طرح نہ مل سکی، سعید بن الربیع اگرچہ بصری الاصل یعنی ہرات کے رہنے والے تھے۔ مگر بصرہ میں آ کر رہ گئے تھے۔ اس لئے طبرستان کے رہنے والے ابن جریر کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سعید بن الربیع نے کب وفات پائی۔ یا ابھی زندہ ہیں یا نہیں۔ سمجھے کہ امام بخاری جو ہمارے ہمعصر ہیں جب ان سے روایت کرتے ہیں تو پھر ہم کیوں ان سے روایت نہیں کر سکتے، خصوصاً جب وہ بھی عجمی ہی تھے، ہرات کے رہنے والے تھے جو خراسان کا ایک شہر ہے، غرض یہ کچھ سمجھ کر ابن جریر صاحب نے بھی حدثنی سعید بن الربیع لکھ مارا۔ اس واقعہ سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ ابن جریر اسناد حدیث گھڑا کرتے تھے، چسپاں کرتے تھے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی تھی، تو جو شخص جھوٹے اسناد گھڑ سکتا ہے کیا جھوٹی حدیثیں نہیں گھڑ سکتا؟ اگر تھوڑی محنت کی جائے تو ایسی مثالیں اور بھی یقیناً مل جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابن جریر کے تلامذہ

انسان اپنے ہم نشینوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ابن جریر کے شیوخ جو واقعی ان کے شیوخ تھے وہ یقیناً شیعہ ہی تھے۔ محدثین اپنے جذبۂ مفاد و روایت پرستی کے لئے شیعہ و رافضی میں فرق کریں یہ ان کا اختیار ہے حقیقت میں تو ہر شیعہ کو رافضی ہی سمجھنا چاہئے۔ غرض یہ کہ جب ان کے شیوخ کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے کہ کون واقعی ان کے شیخ تھے اور کون ایسے تھے جن کے نام ابن جریر نے اپنے ہمعصروں کی کتابوں میں دیکھ کر اپنی حدیثوں میں جوڑ لئے تھے، تو یہ صورت شاگردوں میں تو نہیں ہو سکتی۔ شاگرد جو ان کے تھے وہ تو انہیں کے شاگرد تھے، اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کون کون لوگ تھے، یہ تو تھی ابن جریر کے شیوخ کی کیفیت۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کس قسم کے تھے۔ ان کے متعلق میں طوالت سے بچنے کے لئے مختصر طور سے لکھتا ہوں۔

ابوبکر الشافعی کا نام بھی ابن حجر نے ابن جریر کے تلامذہ میں لکھا ہے۔ میں نے تاریخ مسند امام احمد میں ان کا پورا حال لکھا ہے۔ جو رسالہ البیان امرتسر کے اکتوبر و دسمبر ۱۹۴۲ء کے دو پرچوں میں شائع ہوئی تھی۔ ابوبکر شافعی کا ترجمہ دسمبر کے پرچے میں چھپا ہے۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ان کے متعلق خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی شیعی نے خود یوں لکھا ہے کہ "یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے اور باطن میں شیعہ امامیہ تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے"۔ اور دونوں مذہبوں پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال ص۸۔

محمد بن عبد اللہ القطان

رافضی معتزلی، ان کو محمد بن عبد اللہ بن محمد بن احمد بن ایوب ابوبکر القطان بھی کہتے ہیں۔ مگر عموماً باپ کا نام چھوڑ کر دادا کے نام کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور محمد بن عبد اللہ القطان لوگ لکھتے ہیں۔ ابن حجر لسان المیزان جلد ۵ ص ۲۲۹ میں ان کے متعلق "رافضی معتزلی" لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن جریر سے ان کا حدیثیں سننا تو صحیح ہے الا انه کان رافضیاً۔ کان سیئ المذهب واحسب انه کان یکذب

تفضیل علی ؓ مات ۳۹۸ھ مگر یہ رافضی تھے۔ بد مذہب تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ کو فضیلت دینے کے لئے جھوٹ کا استعمال کرتے تھے

ابراہیم بن حبیب

لسان المیزان میں ابن حجر نے ان کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ طوسی نے ان کا ذکر رجال شیعہ میں کیا ہے، جس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ یہ شیعہ تھے۔

علی بن عبد اللہ بن وصیف الناشی

ابوالحسن الحلاؔ۔ ان کا ذکر بھی لسان المیزان میں ہے۔ اقراری شیعہ تھے ادب و لغت کے ماہر تھے اور تشیع میں غلو رکھتے تھے، ۳۶۵ھ میں نوے برس سے زیادہ عمر پا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

محمد اسحٰق بن مہران ابوبکر المقری شاموخ

یہ بڑے قاری بھی تھے۔ ان سے قرات کی روایتیں بھی مشہور تھے۔ ابن جریر کی من گھڑت قراتوں کی یہ روایت کرتے تھے مگر ابن جریر کے نام سے نہیں کیونکہ ابن جریر کی قراتیں قرات کے بازار میں چالو نہ تھیں، جھوٹی حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے، خصوصاً حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت کے مناقب میں ۳۵۲ھ میں وفات پائی۔ تشیع میں کافی غلو رکھتے تھے۔

محمد بن المظفر

مشہور محدث تھے ابوالولید الباجی کا بیان ہے کہ ان میں تشیع نمایاں تھا۔ ۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۷۷ھ میں وفات پائی۔ ابن جریر کی وفات کے وقت ۲۴ برس کے تھے۔

محض مثال کے طور سے یہ چند نام میں نے لکھ دیئے ہیں اگر کچھ محنت کی جائے تو ابن جریر کے شیعہ تلامذہ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

دو نہیں تین

امام ذہبی اور حافظ ابن حجر تو دو ہی عدد "ابوجعفر محمد بن جریر الطبری" مان کر بالکل دنگ ہو گئے۔ مگر شیعوں کا کام ایک کو دو بنانے سے بھی نہیں چلا، اس لئے ان کی بعض کتابوں میں "ابوجعفر محمد بن جریر الطبری" روایت کرتے نظر آتے ہیں ابوعبد اللہ الحسین الغضائری سے اور غضائری کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی ابوجعفر محمد بن جریر الطبری مفسر متوفی ۳۱۰ھ کی وفات سے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد۔ اس لئے مفسر ابوجعفر محمد بن جریر الطبری تو یہ ہو نہیں سکتے۔ جو ابن یزید تھے۔ اور ابن رستم بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ابن یزید اور ابن رستم ان دونوں میں تو صرف "یزید" اور "رستم" کا فرق ہے۔ اور باقی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں سب میں اور یکسانی کے یہ دونوں فرزند ارجمند توام تھے۔ دونوں کے نام ایک، دونوں کے باپ کے نام ایک دونوں کی کنیت ایک دونوں کا ملک ایک (یعنی طبرستان) دونوں کا "مولد" یعنی جائے پیدائش ایک یعنی شہر آمل "مولد" اسم ظرف ہے۔ اس لئے ظرف مکان ہی میں دونوں متحد نہ تھے۔ بلکہ ظرف زمان میں بھی دونوں متحد تھے، یعنی دونوں کی پیدائش کا سنہ ۲۲۴ھ ایک اور مہینہ دن، تاریخ اور وقت بھی ایک ہی تھا۔ اور پھر دونوں کی وفات بھی بالکل ساتھ ساتھ ایک ہی وقت ایک ہی دن ایک ہی مہینے اور ایک ہی سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی اور پھر دونوں شاید ایک ہی قبر میں ساتھ ساتھ مدفون بھی ہوئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی تو کوئی سنی یا شیعہ ماہر فن رجال و تاریخ یہ ضرور لکھتا کہ ابن یزید ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ابن رستم فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔ ابن یزید ۳۱۰ھ میں مرے تھے اور ابن رستم فلاں سنہ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ابن یزید کی قبر فلاں جگہ ہے اور ابن رستم کی قبر فلاں جگہ، صرف دادا کے نام کو بدل دینے سے ایک شخص ایک سے دو ہو جائے جب تو بڑی آسانی کے ساتھ بہتیرے ایک کو دو کر دیا جا سکتا ہے۔

غرض یزید اور رستم کا فرق تو نکالا تھا شیعوں ہی نے جس کو علمائے اہل سنت نے بھی قبول کر لیا مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اگلے وضاعین و کذابین سے ایسی غلطیاں بہت ہوئی ہیں کہ کسی راوی کا سال ولادت یا سال وفات معلوم نہ ہو سکنے کی وجہ سے قیاس سے کام لیا۔ اور وہ قیاس غلط نکلا۔ بعد والوں نے جب فن رجال کی تدوین شروع کی اور راویوں کے سال ولادت و وفات کا پتہ لگا لگا کر قلمبند کرنا شروع کیا۔ تو جہاں خود ان ائمہ رجال کو اپنے شیوخ کی بعض کمزوریاں محسوس ہوئیں وہاں کسی کا سال ولادت حذف کر دیا۔ کسی کا سال وفات تک کھا گئے جس طرح عبید بن سباق کا سال ولادت و وفات اگر ائمہ رجال لکھ دیتے تو حضرت زید بن ثابت سے ان کی روایت حدیث جمع قرآن کیونکر صحیح ثابت ہو سکتی تھی، اس لئے نہ ان کا سال ولادت کسی نے لکھا۔ نہ سال وفات نہ عمر۔ باوجود اس کے کہ خود امام بخاری نے اپنی تاریخ میں سب کچھ لکھ دیا تھا

لیکن بعد والوں نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خود امام بخاری نے کیوں لکھ دیا تھا؟ وہ اس لئے کہ ان کے دل میں چور نہ تھا اور نہ انھوں نے وہ جمع قرآن والی روایت اپنی کتاب میں درج کی تھی۔ یہ تو پورا "بَابُ جَمْعِ الْقُرْآن" ہی صحیح بخاری میں الحاقی ہے۔ جس کو میں نے اپنی کتاب "جمع القرآن" میں زبردست دلائل سے ثابت کیا ہے اور اگر اس باب کے الحاقی ہونے سے انکار کیا جائے گا تو پھر سارا الزام خود امام بخاری ہی پر عائد ہو کر رہے گا۔ بس اتنا کہنا صحیح ہوگا کہ امام بخاری نے روایت کو صحیح سمجھ کر ابن شہاب زہری کے اعتماد پر اپنی کتاب میں اس کو درج کر لیا۔ پھر بھی کم سے کم ان کی بصیرت فی الحدیث پر حرف ضرور آئے گا۔ اور میرا دل اس کو قبول نہیں کرتا کہ میں ان کو کم بصیرت سمجھوں اور جہاں ائمہ رجال نے سال ولادت و وفات کو ہر کسی کی ضرورت محسوس نہ کی وہاں کتنے وضاعین وکذابین کا راز فاش ہو کر رہا۔ چاہے اگلوں میں سے کسی نے اس راز کو فاش کر دیا۔ چاہے قدرت نے کسی کے متعلق اس حقیر تمنا عمادی کو منتخب کر رکھا تھا۔

اور شیعوں کے یہاں تو حدیثوں کی جمع تدوین ہی دیر کر کے شروع ہوئی۔ رجال شیعہ پر اور بھی بہت دیر کر کے کتابیں لکھی گئیں۔ ابو عبد اللہ الغضائری (یعنی حسین بن الحسن بن محمد بن مقتم بن محمد بن یحییٰ بن جلیس بن عبد اللہ المخزومی الغضائری) جو بغدادی تھے۔ جن کا سال وفات شیعوں کی کتاب تنقیح المقال فی اسماء الرجال میں ۴۱۱ھ لکھا ہے۔ مگر انساب سمعانی میں ۴۱۴ھ ہے۔ اس سے روایت گھڑنے والے صاحب واقف نہ تھے، اس لئے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو ان کا شاگرد لکھ کر طبری کی طرف سے ایک روایت لکھ دی کہ میں نے اپنے شیخ غضائری کے ہاتھ کا لکھا ہوا یوں دیکھا ہے۔ غضائری غریب تو ابو جعفر بن جریر طبری کی وفات سے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تو اب یہ روایت کس طرح درست قرار دی جائے؟ مگر اس دشواری کو دور کرنے میں کوئی دشواری تو تھی نہیں۔ جن لوگوں کو ایک سے دو کرنا آتا ہے۔ ان کو پھر دو سے تین بنا دینا کیا دشوار ہے۔ فوراً ایک اور ابو جعفر بن جریر الطبری تیسرے بھی بنا لئے گئے۔ دوسرے ابن جریر کی تصنیف کے وقت ان کے دادا کا نام یزید ایک ایسا نام تھا جس کا سننا بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے　　بدل دینا یوں بھی ضروری تھا اور پھر اصلی و جعلی میں کچھ تفریق دکھلانے کے لئے تو ضروری تھی۔ اس لئے دادا کے نام کو یزید سے رستم بنا دیا گیا تھا۔ مگر اب کے تو دوسرے کے بعد تیسرے کی تصنیف میں کسی رد و بدل کی ضرورت ہی نہ تھی دونوں تو جعلی ہی ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ دونوں میں کچھ تفریق کیوں پیدا کی جائے۔ اس لئے دوسرے اور تیسرے میں کسی قسم کا بھی فرق نہیں رکھا گیا۔ دونوں کا نام محمد، دونوں کی کنیت ابو جعفر، دونوں کے باپ کا نام جریر، دونوں کے دادا کا نام رستم، دونوں طبرستان کے بسنے والے، دونوں کا مولد آمل، اور دونوں ہی نے امامت پر ایک کتاب لکھی تھی، اور دونوں نے اپنی کتاب کا نام کتاب المسترشد ہی رکھا تھا۔ اور پھر دونوں کا سال ولادت و وفات کو نامعلوم ہی رکھنے میں دروغ بافی پر پردہ رہ بھی سکتا تھا۔ غرض تین ابن جریر تھے ایک تو عامی یعنی ایک اہل سنت تھے جو مفسر تھے جو ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری متوفی ۳۱۰ھ تھے، اور دوسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری جو ابن یزید کے معاصر تھے، اور پھر تیسرے بھی ابو جعفر بن جریر بن رستم الطبری ہی تھے، جو شیعوں کے شیخ الحدیث محمد بن الحسن الطوسی مصنف تہذیب و استبصار (کتب حدیث شیعہ) متوفی ۴۶۰ھ کے ہمعصر تھے۔ جیسا کہ تنقیح المقال میں مامقانی نے لکھا ہے، ان تینوں میں سے صرف پہلے مفسر اور مورخ مشہور تھے اور سنی تھے اور باقی دونوں خاص شیعہ امامیہ تھے۔ اور اہل سنت ائمہ رجال کے نزدیک تو ذہبی ابن جریر تھے، پہلے جو مفسر و مورخ تھے، وہ ہلکے پھلکے شیعہ تھے اور دوسرے جو ان کے بالکل ہمعصر تھے۔ وہ کٹر تھے، تیسرے سے تو اہل سنت علماء غالباً آج سے پہلے واقف بھی نہ ہوں گے۔ بلکہ اگلے شیعہ ائمہ رجال بھی تیسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری سے واقف نہ تھے، اسی طرح شیخ طوسی و علامہ نجاشی و علامہ حلی و شیخ تفرشی بہاء الدین عاملی وغیرہم نے ان تیسرے ابن جریر الطبری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ پہلے پہل ان سے دنیا کو روشناس کیا ہے علامہ شیخ عبد اللہ المامقانی مدظلہ صاحب تنقیح المقال نے جو ۱۳۵۰ھ تک تو زندہ تھے، بعد کا حال معلوم نہیں، اسی لئے وہ خود ان تیسرے ابن جریر کے ترجمے میں لکھتے ہیں لیس لہ ذکر فی کتب اصحابنا الرجالیین یعنی ہمارے ماہرین علم رجال کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر چونکہ ان کو ابو عبد اللہ حسین بن حسن الغضائری متوفی ۴۱۱ھ (و بقول انساب السمعانی ۴۱۴ھ) کا شاگرد سید ہاشم البحرانی نے اپنی کتاب مدینۃ المعاجز میں لکھ دیا ہے۔ اب اس کو نباہنا ضروری ہے (ورنہ اماموں کے معجزے جو گھڑ گھڑ کر سلسلۂ اسناد روایت جوڑ جوڑ کر غریب سید ہاشم البحرانی اپنے عالم بحران میں بمشکل اکٹھا کئے ہیں اور ان کے ذریعے امامت کی کھوکھلی دیوار پر پشتہ لگایا ہے، وہ سب کے سب رائیگاں چلے جائیں گے بحرانی مذکور نے اس کتاب میں اماموں کے معجزے روایتوں کے ذریعہ بیان کئے ہیں۔ جو سب عجیب و غریب ہیں، یہاں ساتویں معجزے کی تفصیل تو مذکور نہیں، صرف پتھر سے شہد نکلنے کا ذکر کیا ہے۔ اور بتیسواں۳۲ معجزہ حضرت حسن بن علی کا بیان کیا ہے کہ وہ بھیڑیئے سے کچھ بولے تو بھیڑیئے نے ان سے باتیں کیں) اس کتاب میں بہت سی روایتیں ابن جریر الطبری کی کتاب المسترشد فی الامامۃ سے بھی منقول ہے۔ ایک جگہ کتاب المسترشد ہی سے یوں نقل کیا ہے "قال ابو جعفر بن جریر الطبری" اس کتاب المسترشد کے مصنف تو خود ابو جعفر بن جریر الطبری ہی ہیں۔ وہ کیوں لکھنے لگے کہ "ابو جعفر بن جریر الطبری نے کہا"؟ بس اس سے معلوم ہو گیا کہ دو ابن جریر بن رستم الطبری ہیں۔ وہ ابن جریر بن یزید تو عامی تھے کوئی خاصی یعنی شیعہ ان سے کیوں روایت کرنے لگا! اس لئے یہ تو لکھ نہیں سکتے تھے کہ ابن رستم نے ابن یزید سے روایت کی ہے، حالانکہ اگر واقعی کوئی ابن جریر بن رستم بھی تھے، تو وہ ابن جریر بن یزید کے ہمعصر تھے، اس لئے ایک دوسرے سے روایت کر سکتے تھے۔ مگر جب غضائری صاحب ان دونوں ہمعصروں کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے تو غضائری کے شاگرد تیسرے ابن جریر الطبری جو یقیناً پانچویں صدی کے آدمی ہوں گے یا چوتھی صدی کے آخر کے وہ کس طرح سو سوا سو برس قبل کے آدمی سے روایت کر سکتے ہیں؟ بالفرض ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری الآملی دو تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان سوا سو برس ڈیڑھ سو برس کا فاصلہ ہو تو پھر دونوں کے درمیان سلسلۂ روایت بلا واسطہ کیونکر صحیح مانا جا سکتا ہے۔

غضائری سے ابو جعفر بن جریر الطبری کی جو روایت بنائی گئی تھی، صرف اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری بنائے گئے تھے۔ تاکہ جس کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۴ھ میں ہو اس سے اس ابو جعفر بن جریر الطبری کی روایت صحیح ہو سکے۔ مگر پھر جو ان دونوں ابن جریروں کے درمیان سلسلہ روایت بیان کر دیا گیا۔ تو وہی دشواری بلکہ اس سے بھی سخت دشواری باقی رہ گئی۔ وہ اس طرح کہ سابق ابن جریر بن رستم ہمعصر ہیں ابن جریر بن یزید متوفی ۳۱۰ھ کے اور ہمعصری بظاہر مقتضی ہے ہم سنی کے امید　یہی کی جاتی ہے کہ دوسرے ہمعصر کی بھی وفات دو چار برس پہلے یا بعد کو ہوئی ہوگی۔

اور غضائری کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۴ھ میں ہے تو ان کے شاگرد کو بظاہر قیاس ان سے چھوٹا ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے تیسرے ابو جعفر محمد ابن جریر بن رستم الطبری جو غضائری کے شاگرد تھے بظاہر قیاس غضائری کے دس پانچ برس بعد ہی مرے ہوں گے۔ تو پھر جب غضائری کی روایت سابق ابن جریر سے مستبعد ہو تو غضائری کے ایک شاگرد کی روایت سابق ابن جریر سے کس طرح ممکن ہوگی فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَرَّ فِي الْمِيزَاب جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو اور ان کو صحیح ثابت کرنے والوں کو اس قسم کی دشواریوں کا سامنا اکثر کرنا پڑتا ہے۔ غرض دونوں ابن جریر ابن رستم بتقاضائے مصلحت تصنیف کر لئے گئے تھے۔ ایک کو اگلوں نے تصنیف کیا تھا۔ اور دوسرے کو صاحب تنقیح المقال علامہ شیخ عبد اللہ المامقانی نے جو ۱۳۵۰ھ تک یعنی آج سے چوبیس سال قبل تک تو ضرور زندہ تھے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس وقت بھی زندہ ہوں گے۔ خدا کرے کہ زندہ ہوں۔ اور میری یہ تنقید ان کی نظر سے گذر جائے۔

انسانی معاشی مسئلہ
عقل کی رو سے نہیں
وحی کی مدد سے طے ہو سکتا ہے
عقل نے کیا سوچا؟ —— وحی نے کیا دیا؟
یہ آپ کو نظامِ ربوبیت میں ملے گا۔۔۔!!

باب المراسلات

طاہرہ بیٹی کا خط

یہ قرآنی تعلیم کی جاذبیت کا حیرت انگیز اثر ہے کہ تھوڑے سے عرصہ میں ملک میں ہزاروں "سلیم" اور سینکڑوں "طاہرہ بیٹیاں" پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان کا سلسلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ ان کے تاثرات کیا ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے۔ جو کیمبلپور کی ایک "طاہرہ بیٹی" نے اپنے "قرآنی چچا جان" (پرویز صاحب) کو لکھا ہے

آپ کا خط ملا۔ نظام کی عدم موجودگی سے معاشرہ میں جو ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ انھیں سامنے لاؤں۔ کافی دن اسی تجویز پر غور کرتی رہی ہوں۔

چاچا جان! اگر گرد وپیش پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو سوائے تلخیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ روزانہ اخباروں میں قومی اخلاق کا مظاہرہ کچھ اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ ایک حساس دل ان کاغذوں پر نظر ہی نہیں ڈال سکتا۔ میں نے تو عرصہ تین سال ہوا کوئی اخبار۔ کوئی رسالہ سوائے قرآن اور طلوع اسلام کے علاوہ دوسری کوئی کتاب دیکھی تک نہیں۔ اپنی قوم کی گری ہوئی حالت کو دیکھنا کس طرح برداشت کروں۔ میں مایوس نہیں ہوں خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔ امید کی ایک جگمگاتی ہوئی کرن اس تڑپ کو تیز اور حوصلہ کو بلند سے بلند تر کرتی ہے۔

دراصل یہ رونا مجھ سے رویا نہیں جاتا۔ میں نے تو یہ شعار زندگی بنا لیا ہے کہ

حق کی جستجو میں رہوں گی۔ نیکی کروں گی۔ قرآنی مفہوم کو اپنے اندر جذب کر کے قرآنی زندگی بسر کروں گی۔ بس

موجودہ تلخیوں کا واحد علاج قرآنی معاشرہ کا قیام ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ قرآنی نظریہ کو عام کر دیں۔ اسی سلسلہ میں "قرآنی معاشرے کا معاشی نظام" کے عنوان سے قرآنی فہم کے مطابق ایک مضمون لکھا ہے۔ اب چاہتی ہوں کہ اسے ایک دو عام اخباروں میں بھجوا دوں۔ تاکہ شائع ہو جائے۔

سمندر میں کنکریوں کے پھینکنے سے پانی میں ہلچل تو مچ جاتی ہے نا۔ شاید اس جمود کو کوئی توڑ دے۔

ہمارا کام ہے فرض کو پورا کرنا۔ آگے خدا کی مرضی۔

ایک خیال مجھے چند دنوں سے پریشان کئے ہوئے ہے جو لوگ حق کا مطالعہ کرتے ہیں بجائے اس کے کہ ایک لڑی میں منسلک ہو جائیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

ان کا مقصد حق کی تلاش ہوتا ہے۔ یا اپنی شخصیت کو شہرت دینا۔

آپ کی بیٹی

پرویز| عزیز بیٹی! ہمارے معاشرہ میں جو ناہمواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ انھیں سامنے لانا محض "رونا" نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہو رہی ہے کہ مریض تپ دق کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتا یہی ہے کہ وہ بالکل تندرست و توانا ہے۔ لہٰذا اس کے علاج کے لئے ضروری ہو کہ اسے بتایا جائے دکھایا جائے کہ وہ تندرست نہیں، بیمار ہے۔ جب تک اسے یہ محسوس اور معلوم نہیں ہو گا کہ وہ بیمار ہے۔ اور اس قدر شدید بیمار۔ وہ اپنے علاج کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو گا۔ اپنی معاشرتی ناہمواریوں کو سامنے لانا۔ مریض کو اس کے مریض ہونے سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے اس کا علاج بتانا چاہیئے۔

باقی رہا تمہارا دوسرا سوال۔ سو متلاشیانِ حق میں سے ایک طبقہ تو ایسا ہوتا ہے۔ جن کا مقصد (شعوری یا غیر شعوری طور پر) محض اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ انھیں متلاشیانِ حق کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ جو لوگ درحقیقت متلاشیانِ حق ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ رہ سکتے ہیں۔ جب تک حق ان کے سامنے بے نقاب نہ ہو جائے۔ حق کے منکشف ہو جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف تو ایک طرف، ایک دوسرے سے الگ بھی رہ سکیں۔ حق قرآن کے اندر ہے اور جو لوگ اس حق کو پا لیتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی اپنی "مسجدیں" الگ الگ نہیں بناتے۔ ان کی تو بلکہ کیفیت وہ ہو جاتی ہے، جسے غالبؔ نے اپنے خاص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ذوقیست ہمدمے بہ نغاں جگز دم زرشک
خارِ رہست بہ پائے عزیزاں خلیدہ ماند

لیکن اختلافات مٹانے اور ایک کو دوسرے سے قریب تر کرنے کا حقیقی ذریعہ قرآنی نظام ہے۔ نہ کہ قرآن کا انفرادی طور پر سمجھنا۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے تو پھر الف بین قلوبکم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نظام اور مرکز کے بغیر یہ نماز، صلوٰۃ بے امام کا نقشہ لئے ہوتی ہے۔ جس میں ایک کھڑا ہوتا ہے۔ ایک بیٹھا، ایک رکوع میں ہوتا ہے ایک سجدے میں۔ امام ان سب میں ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا کرتا ہے۔

فطرانہ

رسالپور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ فطرانہ سے متعلق قرآنی احکام سے مطلع کیا جائے

جواب| فطرانہ کے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ روایات میں اس کا حکم ملتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ نے اس کی بابت حکم دیا تھا تو وہ حکم اس دور سے متعلق ہو گا۔ جب قرآنی معاشرہ اپنی ابتدائی منازل میں ہو گا۔ اس وقت انفرادی خیرات ضروری تھی۔ تاکہ غریبوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ لیکن جب حضورؐ کے ہاتھوں سے مشکل فرمودہ قرآنی نظام عمل میں آ گیا۔ اور حکومت یعنی ذرائع پیداوار و اشیاء کا نظم ونسق ملت کے اجتماعی ہاتھوں میں آ گیا۔ تو اس کے بعد انفرادی خیرات کی ضرورت کہاں رہ سکتی تھی؟ اس وقت ہمارے ہاں فطرانہ چھوڑ، زکوٰۃ تک بھی خیرات میں داخل ہے اور جب تک قرآن کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کو باقی رکھنا چاہیئے۔ تاکہ ان کے ذریعہ کوئی خیراتی کام ہو سکیں لیکن اس وقت بھی اس کی ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ رقوم بھیک منگوں کی جھولی میں جا پڑیں۔ ان کی جمع وتحصیل اور پھر مناسب مقامات پر خرچ کا انتظام اجتماعی طور پر کیا جائے۔

حقائق و عبر

ایک اور دلیل

محترم عبدالماجد صاحب دریا بادی نے وزیر اعظم (محمد علی صاحب) کے عقد ثانی کے متعلق اپنے اخبار صدق کی ۹ر اپریل کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ تحریر فرمایا ہے۔

"پاکستان کی خبر ہے کہ وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اپنی پہلی زوجہ محترمہ کی موجودگی میں دوسرا عقد ایک عرب خاتون سے کر لیا، جو اب تک ان کی سکریٹری تھیں۔ خبر کا شائع ہونا تھا کہ جیسے ایک آگ لگ گئی۔ اور ہر طرف سے ملامت و احتجاج کی بھرمار ہونے لگی۔ درحقیقت وزیر محترم قابل مبارکباد ہیں کہ ایسے ملک میں جہاں عقد ثانی ایک "جرم" بنتا جا رہا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ "روشن خیالی" یا تقلید فرنگ نے عقد ثانی کو ایک معصیت کے درجہ میں رکھ دیا ہے، اپنے اس شرعی حق کا استعمال کر کے ایک نمایاں ثبوت اپنی اخلاقی جرأت و ہمت کا دیا۔ اللہ ایسا کرے کہ انھیں پہلی زوجہ محترمہ کے ساتھ بھی پورے حسن سلوک کی توفیق نصیب رہے۔ تاکہ تعدد ازدواج بدنام نہ ہونے پائے اور ان کی روشن مثال سے دوسروں کی ہمت افزائی ہو

اعتراضات اب تک جتنے شائع ہوئے ہیں سب بے وزن بلکہ مہمل ہیں۔ اکثر صورتوں میں تو محض تہذیب فرنگ سے مرعوبیت کے غماز ہیں۔ اور بعض صورتوں میں تو کہا جائے کہ اس سے بھی پست تر ذہنیت کی جھلکیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ حالی نے سرسیدؒ کے ایک معاند کی ذہنیت کی ترجمہ و تحلیل خود اس کی زبان سے یوں کی ہے

رنج اس کا کچھ نہیں مجھکو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

تو حسد و رشک بھی کبھی کبھی اپنے کو نکتہ چینی کے لباس میں چھپا لیتا ہے۔ اور انسان جس نعمت کا حصول اپنے لئے دشوار یا ممتنع پاتا ہے۔ دوسرے سے اس نعمت کے سلب یا زوال کی تمنا کرنے لگتا۔ اور اسے برا بھلا ہی کہہ کر اپنا دل خوش کرنے لگتا ہے۔"

(اگلا صفحہ دیکھئے)

محترم دریا بادی صاحب نے چونکہ کالج میں سائیکولوجی پڑھی تھی اس لئے انھوں نے تعدد ازدواج کے مخالفین کا نفسیاتی تجزیہ فرما کر ان کے جذبۂ محرکہ کی ٹوہ لگائی ہے۔ لیکن ایک سائیکولوجی کا طالب علم یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ دریا بادی صاحب کی طرف سے عقد ثانی کی جو اس شدت سے تائید ہو رہی ہے۔ کہیں اس کا جذبۂ محرکہ یہی تو نہیں۔ کہ انھوں نے جو ایک عرصہ پہلے خود عقد ثانی فرمایا تھا ان کا "مجرم ضمیر" (جسم یہ سائیکولوجی کی اصطلاح میں لکھ رہے ہیں) غیر شعوری طور پر اس کے جواز کی سند ڈھونڈھ کر اپنے آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہے؟

ہم محترم دریا بادی صاحب کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس طنز و طعن سے الگ مسلمانوں کے یہاں ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ وہ کبھی قرآن سے بھی تو پوچھ لیا کریں کہ فلاں معاملہ (مثلاً تعدد ازدواج) کے متعلق اس کا کیا حکم ہے؟ خدا کرے کہ عمر کے اس آخری حصے میں ہی انھیں اس کی توفیق مل جائے کہ وہ دین سے متعلق امور کے لئے قرآن کی طرف رجوع فرمایا کریں اس قرآن کی طرف جسے حضور نبی اکرمؐ نے خدائے پاک امت کو دیا تھا نہ کہ اس قرآن کی طرف جسے طبری اور رازی نے پیش کیا تھا اور جس کی تفسیر اب خود دریا بادی صاحب نے لکھی ہے، جس میں قرآن کے علاوہ اور سب کچھ ہے۔

اللہ کی قدرت کاملہ

"لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو جب یہ منظور ہوا کہ ڈاکٹر جیل سے باہر آ جائے۔ تو قانون کی دنیا میں زلزلہ آ گیا۔ بڑے بڑے سر بفلک "محلات" زمین بوس ہو گئے "پہاڑ" ریزہ ریزہ ہو گئے۔ "بستیاں" تہ و بالا ہو گئیں۔ اور قید خانے کا پھاٹک یکایک کھل گیا۔ اور اس میں وہ داعیٔ حق ___ سید ابوالاعلیٰ مودودی ___ نکل کر باہر آ گیا۔" (ایشیا لاہور بابت ۹ مئی ۱۹۵۵ء)

آپ نے غور فرمایا کہ جماعت اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے، اللہ میاں نے ان کے امیر کے سلسلے میں کیا "تقسیم عمل" فرما رکھی ہے؟ یعنی مودودی صاحب کو جیل میں تو بھجواتے ہیں طاغوتی حکومت کے نمائندے۔ اس لئے وہ ہر قسم کی لعن طعن کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن دو تین سال کے بعد انھیں جیل سے نکالتے ہیں خود اللہ میاں۔ جیل میں بھجوانے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ اس کی مشیت، مرضی، قدرت، کے خلاف ہوتا ہے لیکن جیل سے باہر آنا اللہ کی مشیت، مرضی، قدرت کے مطابق ہوتا ہے دنیا کا تو علم نہیں لیکن اسلام کی تاریخ میں اس قسم کی جہالت کی مثال شاید ہی کہیں اور ملتی ہو۔

محض دین سے نہیں

اس سلسلے میں اخبار "ایشیا" مودودی صاحب کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوم کو اس کی تمام کمزوریوں کوتاہیوں اور خامکاریوں کے باوجود خدا کے دین سے محبت ہے۔ محض دین سے نہیں بلکہ اس تصور دین

۹ سے محبت ہے، جو مولانا مودودی صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔

یہ ہے جماعت اسلامی کی صحیح تصویر۔ یعنی ان کے نزدیک محض خدا کا دین محبت کے قابل نہیں۔ محبت کے قابل وہ تصور دین ہے جسے مودودی صاحب پیش فرماتے ہیں۔ اور جو شخص ان کے پیش کردہ تصور دین سے محبت نہیں کرتا۔ وہ دین سے خارج ہے۔

یہ ہے وہ شخصیت پرستی جس کے سیلاب میں عقل اور دین دونوں بہہ جاتے ہیں۔

بزم طلوع اسلام

جوں جوں تحریک طلوع اسلام کا چرچا عام ہوتا جاتا ہے مخالفین تحریک اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کرتے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فرمان "عدو شود سبب خیر" اگر خدا خواہد" ... "معدوم یارست" کے مصداق ہم ان حضرات کے مشکور ہیں کہ وہ جہاں طلوع اسلام نہیں پہنچتا وہاں بھی اس کا پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ یہ حضرات نجی گفتگو میں، کھلی محفلوں میں، مسجدوں میں پبلک جلسوں میں اخبارات میں غرضیکہ ہر جگہ صبح و شام طلوع اسلام کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ ہر چند یہ ذکر غالب کے الفاظ میں کس کس برائی سے ہوتا ہے۔ لیکن

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اس مخالفت کا یہ اثر ہوا ہے کہ جن طالبان حق کے کانوں میں طلوع اسلام کی بھنک پڑ جاتی ہے۔ وہ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے اور اسے سمجھنے کے خواہشمند ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے حضرات کے دلوں میں بعض وساوس بھر دیئے جاتے ہیں اس لئے بزم ہائے طلوع اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کو رفع کرنے کے لئے تیار رہیں۔ انھیں چاہیئے کہ وہ ذاتی طور پر ایسے حضرات سے مل کر بھی ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کریں۔ اور مقامی اور علاقائی اخبارات میں مناسب مضامین شائع کرا کے بھی علاقے بھر کو طلوع اسلام کی دعوت سے متعارف کرائیں۔

ہمارے بعض قارئین مخالفانہ مضامین کے تراشے ہماری طرف بھیج دیتے ہیں اور اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ ہم فرداً فرداً ہر ایک کا جواب دیں۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کے لئے یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ ہم اپنے قارئین اور بزموں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ مخالفانہ مضامین کے جوابات از خود دیا کریں۔ طلوع اسلام نے اپنا مفہوم و مقصد بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی ابہام نہیں چھوڑا ہے۔ تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ اندریں حالات قارئین کے لئے اس کی روشنی میں مدافعانہ مضامین لکھنا چنداں مشکل نہیں ہونا چاہیئے۔ بزموں کو خصوصیت سے ادھر توجہ دینی چاہیئے۔

راولپنڈی — مقام مسرت ہے کہ کئی بزموں نے مقامی حالات کے مطابق مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے راولپنڈی کی بزم نے دارالمطالعہ قائم کر رکھا ہے۔ اس میں مطالعہ ہی کا انتظام نہیں بلکہ شکوک و اعتراضات کے بھی جوابات دیئے جاتے ہیں۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے۔

بزم ہفتہ وار اجتماع بھی منعقد کرتی ہے۔ یہ اجتماع ہر جمعے کو شام کے ۵ بجے سے ۷ بجے تک شیخ عبداللطیف صاحب (مکان عزیز منزل واقع براڈن لو اسٹریٹ صدر) میں ہوتا ہے۔ اجتماع میں معارف القرآن جلد سوم کا درس ہوتا ہے۔ اور طلوع اسلام کے منتخب مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ پھر تبادلہ خیال ہوتا ہے اور ہر رکن ہر ہفتے بھر کے تجربات بھی بیان کرتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں لائحہ کار میں اصلاح و ترمیم کی جاتی ہے۔

بزم نوجوانوں کی ضروریات و مشکلات پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور انھیں قرآنی فکر سے متعارف کرانے میں منہمک ہے اس کے زیر غور ایک امدادی اسکیم ہے۔ جس کی رو سے ضرورتمند ارکان بزم کی مناسب مدد کی جا سکے گی۔

ڈھاکہ — محمد صابر علی صاحب ۳۰ کپتان بازار، ڈاک خانہ واری ڈھاکہ اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی بزم عرصہ دو سال سے مصروف عمل ہے۔ ہر دوسرے جمعہ کو اس کا اجتماع قائداعظم کالج میں منعقد ہوتا ہے، بزم نے ایک لائبریری بھی قائم رکھی ہے جہاں سے کتابیں مطالعہ کے لئے بھی دی جاتی ہیں اور مستحقین کو مفت بھی دیدی جاتی ہیں۔ یہ بزم بھی بحمداللہ سرگرمی سے تبلیغ مقاصد میں مصروف ہے۔ ڈھاکہ اور گرد و نواح میں تحریک کا جو چرچا ہو رہا ہے۔ وہ بہت حد تک اسی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

نقد و نظر

سوچیئے اور دولت کمایئے — مصنف:۔ نپولین ہل۔ مترجم محمد غوث صدیقی۔

مجلد گرد پوش ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے شائع کردہ نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی

اردو میں عملی نفسیات پر طبع زاد تصانیف کی بڑی کمی ہے اس لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان اور دوسری زبانوں سے اردو تراجم کئے جائیں۔ تاکہ مناسب مواد مل جائے۔ زیر نظر کتاب اسی قبیل کی کوشش ہے۔ یہ نپولین ہل کی تصنیف ہے۔ جسے محمد غوث صدیقی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب کا مقصد (بقول مصنف) ان لوگوں کی مدد کرنا ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ احساس ناکامی کو کس طرح احساس کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اور دماغ سے کام لے کر کس طرح دولت کمائی جا سکتی ہے۔ اور کس طرح زندگی کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسی مثالیں دی گئی ہیں جن سے کتاب کے قاری کے دل میں جرأت و ہمت کے جذبات پیدا کرنا مقصود ہے۔ مترجم نے بعض ابواب میں پاکستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں اپنی طرف سے کچھ پند و نصائح کا اضافہ کر کے کتاب کو اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ترجمہ جلدی میں کیا گیا ہے۔ اگر ترجمے پر نظر ثانی کر لی جاتی تو کتاب اور زیادہ رواں اور شستہ ہو سکتی تھی۔ عملی نفسیات کے موضوع سے

(باقی [illegible] پر)

اندرون ہند

پنڈت نہرو کی کانگریس پارٹی ہندوستان کی وہ جماعت ہے جس کا ہمیشہ یہ دعوے رہا ہے کہ وہ ایک فرقہ دار نہیں بلکہ قومی جماعت ہے۔ تقسیم کے بعد کانگریس نے خصوصیت سے یہ دعوے باندھا کہ وہ ہندوستان کے سب فرقوں کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے فرقہ پرستی کا قلع قمع کرکے چھوڑے گی۔ لیکن ہندو کی ذہنیت میں نفرت کچھ اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ تعصب سے بلند جا ہی نہیں سکتا۔ کہنے کو تو اس نے اپنے ہاں سیکولر یعنی غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ حکومت بنائی۔ لیکن عملاً وہ ہندو حکومت ہی ہے۔ حکومت تو ایک طرف خود کانگریس جس کی حکومت ہے بدستور متعصب ہندو جماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود یکہ مسلمانوں نے کانگریس ہی کو اپنی جماعت سمجھنے کی کوشش کی۔ انھیں اس کے دامن میں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ چنانچہ اب وہ اس سے بددل ہو کر کٹ رہے ہیں۔ چونکہ فرقہ پرستی کے خلاف جو مہم ہے۔ اس کا نشانہ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اس لئے ان کے لئے قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم کریں۔

ابھی دنوں علی گڈھ کے ایک اخبار نے مقامی کانگریس کی ہیئت و ترکیب کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ کانگریس کا سلوک مسلمانوں سے کتنا تنگ نظرانہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اپریل میں کانگریس کمیٹی کے جو انتخاب ہوئے۔ اس کے متعلق نئے منتخب شدہ صدر نے اعتراف کیا ہے کہ مجھے اس بات سے بڑا دکھ پہنچا ہے کہ وارڈوں کے چناؤ میں اس بات کا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو نہ چن جائے۔ لہٰذا اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب ہم ان وارڈوں کے چناؤ پر نظر ڈالتے ہیں (جہاں مسلم اکثریت ہے) تو ہندو فرقہ پرستی کا کھلا ناچ نظر آتا ہے۔ جو کانگریس کے لئے شرمناک ہے۔ پانچ وارڈوں میں جہاں غیر مسلم اکثریت تھی۔ ایک مسلمان کانگریسی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ خصوصاً نائب حسین صاحب کاظمی اور قدیمی کانگریسی نشی خان صاحب کو سازش کے ساتھ شکست دی گئی (اس کے برعکس مسلم اکثریت کے وارڈ نے پانچ میں سے دو ہندوؤں کو چنا۔ اور ایک ہندو بھائی کو تو سارے ووٹ دیئے۔ اور اپنے وارڈ کا صدر بھی متفقہ طور پر ہندو ہی کو چنا۔ یہ سب کچھ اس مرکزی شہر میں ہو رہا ہے جہاں دوسرے ممالک کے سفراء اور وزراء کو بلاکر ہماری حکومت ہندو کی رواداری اور اقلیت نوازی کے نمونے اکثر و بیشتر دکھاتی رہتی ہے۔"

یہ صورت حال علی گڈھ تک محدود نہیں۔ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا حال یہی ہے۔ چنانچہ وہ ایک عجیب منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ جداگانہ تنظیم کا رستہ ان کے لئے مسدود ہے۔ وہ آہ بھی کرتے ہیں۔ تو بدنام ہو جاتے ہیں۔ کانگریس کا سلوک دیکھ کر وہ اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ دوسری کوئی ایسی جماعت نہیں جس میں وہ اطمینان سے شریک ہو سکیں۔ یہ صورت نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے نہ ہندوستان کے لئے۔ مسلمانوں جیسی اہم اقلیت نہ ملکی حالات سے بے تعلق رہ سکتی ہے۔ نہ اسے اس حد تک اپاہج بنایا جا سکتا ہے۔ حکومت ہند کی پالیسی ذرا فراخدلانہ ہوتی تو مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں مناسب مقام متعین ہو جاتا۔ اور اس میں دونوں کا بھلا ہوتا۔ یہ وقت ہے کہ مسلمان سوچیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے ذمہ دار ارباب سیاست زمانہ کا رنگ دیکھ کر ہمت ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کی تگ و دو مذہب تک محدود ہو گئی ہے۔ یہ حالات کا اضطراری تقاضا ہی سہی۔ لیکن کیا ملکی سیاست سے یوں کنارہ کش رہا جا سکتا ہے۔ مسلمانان ہند کو بہرحال اس کا حل سوچنا ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلم جماعت جس نے اس طرح سوچنا چاہا گوناگوں مصائب کا نشانہ بن گئی ہے لیکن اگر مسلمانوں کے لیڈر ٹھنڈے دل سے ان حالات پر غور کریں۔ اور دوسروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے آپ پر بھروسہ کریں۔ تو وہ موجودہ جمود و تعطل کا خاتمہ کرکے مسلمانوں میں حرکت و عمل پیدا کر سکتے ہیں۔ اور انھیں بھی دوسرے فرقوں کے دوش بدوش کھڑا کر سکتے ہیں۔

ہندو کی فرقہ پرستی کے اور مظاہر ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستانی آئین کے مطابق اردو ان چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ جو ہندوستان کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ پنڈت نہرو نے اکثر اردو کو ہندوستان کی زبان کہا ہے۔ بلکہ ایک موقعہ پر تو انھوں نے کہا تھا کہ اردو پاکستان کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ لیکن اس زبان سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ یوپی میں اسے علاقائی زبان بنانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں۔ وہ سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یوپی سے بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک درخواست صدر جمہوریہ ہند تک پہنچائی گئی ہے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ اس درخواست کو ایک سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر صدر جمہوریہ خاموش ہیں۔ اس دوران میں البتہ دہلی میں بھی اردو کو دیس نکالا مل گیا ہے۔ حالانکہ دہلی کے ایک اخبار کے مطابق "۹۹ فی صدی لوگوں کی زبان اردو ہے۔ دہلی میں آئے ہوئے ریفیوجیز بھی اردو ہی سمجھتے ہیں۔ آریہ سماجی اخبارات بھی اردو ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو کی مخالفت کرنے والے اخبارات بھی اردو ہی میں چھپتے ہیں۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس کے باوجود دہلی کی بلدیہ تک نے یہ حکم صادر کر دیا ہے کہ پرائمری اسکولوں کے بچے اپنی کتابیں ہندی میں لائیں۔ یہ ان اسکولوں کا حال ہے۔ جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ گویا جو بچے اردو پڑھتے رہے ہیں۔ وہ بھی مجبور ہوں گے کہ ہندی کتابیں لائیں۔ درانحالیکہ وہ ہندی نہیں جانتے۔" اور یہ محض اس لئے کیا جارہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور بقول مہاتما گاندھی "قرآن کے حروف میں" لکھی جاتی ہے۔

اسی دہلی میں جہاں پنڈت نہرو سیکولرازم اور سوشلزم کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں۔ کسٹوڈین کے محکمہ سے مزید پانچ سو مسلمانوں کے نام نوٹس جاری کئے جا رہے ہیں۔ کہ وہ ثابت کریں کہ وہ ہندوستان کے شہری ہیں پاکستان کے شہری نہیں ہیں۔ یعنی دہلی میں اپنے ذاتی مکانوں میں رہنے کے باوجود انھیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اسی ملک کے شہری ہیں۔ حالانکہ اگر محکمہ کسٹوڈین کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ متعلقہ اشخاص پاکستانی شہری ہیں۔ تو وہ ان سے مطالبہ کریں کہ اسے غلط ثابت کریں ورنہ نتائج بھگتیں۔ یہ تو دہلی کا حال ہے۔ دوسری جگہوں پر جو کچھ ہو رہا ہوگا۔ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندو بھاگ رہے ہیں اور وزیر تک جا جاکر حالات کا بچشم خود مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ نہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ اور نہ پاکستانی وزیر ہی انھیں ادھر متوجہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں کس قدر گھٹن پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امیر فیصل (سعودی عربیہ کے وزیر اعظم) جب پاکستان آنے سے پیشتر ہندوستان گئے۔ تو ہوائی اڈہ پر مسلمان بھی گئے۔ اور انھوں نے مہمان کو دیکھ کر تین دفعہ نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد یہ پہلا پبلک نعرۂ تکبیر ہے (غالباً اس کے لئے پہلے سے اجازت حاصل کی گئی تھی) اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ شہریت کے حقوق تمام فرقوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ ایک موقعہ پر پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ انھوں نے "فرقہ پرستی" کو ختم کر دیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کی بات سو فیصدی صحیح ہے۔

نقد و نظر

صفحہ ۱۵ سے آگے

دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام قارئین کو بھی اس کتاب میں کچھ نہ کچھ مل جائیگا۔

کتاب کا یہ انداز ہمارے نزدیک کسی صورت مستحسن نہیں کہلا سکتا کہ کسی انسان کی کامیابی کا پیمانہ اس کی دولت ہو۔ چنانچہ علم کو بھی اسی پیمانے میں ماپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس پر اس بے علمی کو ترجیح دی گئی ہے جو بٹن دبا کر ماہرین کو طلب کر سکے اور "بلا محنت اور کوشش" جو چاہے حاصل کر سکے۔ پانچویں باب میں ہنری فورڈ کی مثال سے کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق پوری تفصیل

مقام حدیث

میں دیکھیے

کتاب دو جلدوں میں ہے

قیمت

فی جلد

چار روپے

بین الاقوامی جائزہ (صفحے سے آگے)

بلاک میں بھی مفاہمت پسندی کا مظاہرہ کرے اور اقوام مغرب کو وحدت جرمنی کا چکمہ دینے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن بظاہر اقوام مغرب کے اس فریب میں آنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن عمومی فضا کچھ ایسی: امن پسندی کی سی ہوتی جا رہی ہے کہ مصالحت خواہی کے منافقانہ مظاہروں کو بھی مسترد کرنا دشوار ہو جائے گا۔

اس مفاہمت پسندی کی فضا میں روس اپنے مقاصد حقیقی سے غافل نہیں۔ اس نے انہی دنوں وارسا میں آٹھ قومی کانفرنس طلب کی۔ اور اس میں اشتراکی ناٹو کی داغ بیل ڈالی۔ وارسا میں ایک معاہدہ ہوا ہے جو تیس سال تک نافذ العمل رہے گا۔ اس کی رو سے شریک ممالک کی ایک ہی فوجی کمان بنا دی گئی ہے۔ یہ کمان روسی جرنیل مارشل آئون کونیف کے تحت ہوگی۔ اور اس کا صدر مقام ماسکو ہوگا۔ بیرونی حملہ کی صورت میں مشترکہ کارروائی کی جائے گی۔ وارسا کانفرنس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ یہ معاہدات پیرس کی تصدیق کا جواب ہے۔ اس معاہدہ میں دوسری قوموں کی شرکت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کا اعلان ہوتے ہی چین نے اعلان کیا کہ ساٹھ کروڑ چینی اپنے آپ کو ہر قسم کی مدد کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ روس نے ایک غیر معمولی اور ناقابل یقین اقدام کیا ہے۔ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ایک اعلیٰ روسی وفد بلگریڈ (یوگوسلاویہ) جا رہا ہے اس میں وزیر اعظم مارشل بلگانن اور کمیونسٹ پارٹی کے قائد خروشیف بھی شریک ہونگے روس کے قائدین اعلیٰ کا خود بلگریڈ جانا بہت بڑی بازی ہے اور اس نے اقوام مغرب کے حلقہ میں بجا طور پر تشویش پیدا کر دی ہے اگر یہ حربہ کامیاب ہو گیا۔ تو یورپ میں غیر جانبداری کا حلقہ قائم ہو چکا ہوگا اور یہی روس کا مقصود ہے۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے کچھ پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر (ایک پرچہ)
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کا مضبوط و حسین جلد معہ گرد پوش۔ قیمت۔ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے: اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۵ صفحات قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمجھی ہوئی تاریخ۔ ۲۷۶ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۴ صفحات قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ چار سو صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

نظام ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور، دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت ساڑھے تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول۔ چھ روپے۔ قسم دوم۔ چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳/۷۳۔ کراچی

عالمِ اسلامی

عالم اسلامی کی توجہ زیادہ تر افغانستان پر مرکوز ہے۔ ہمارے اس پاگل ہمسایہ کے مزاج ابھی درست نہیں ہوئے۔ پاکستان نے ناچار ۱۵ مئی کی تاریخ مقرر کی کہ اگر اس دن تک افغانستان نے معافی نہ مانگی۔ اور تلافی مافات نہ کی۔ تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے سخت اقدام کیا جائے گا۔ ملک میں عام مطالبہ جو تجارتی مراعات یک قلم ختم کر دینے کا تھا۔ افغانستان کا یہ نہایت کمزور پہلو ہے۔ کیونکہ اس کی تجارت بیرونی دنیا سے صرف پاکستان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ راستہ بند کر دیا جائے تو اس کی ساری تجارت درآمد برآمد معطل ہو کر رہ جائے۔ افغانستان کو اس کا کماحقہ احساس ہے لیکن اس کی بے خردی اور عاقبت نا بینی کا یہ عالم ہے کہ اس کے نمائندے نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پاکستان نے ایسا اقدام کیا تو وہ روس کے ذریعہ دنیا سے تجارت کریں گے۔ اس کا مطلب بالفاظ صحیح تر یہ ہے کہ افغانستان جان بوجھ کر خود کشی کرے گا۔ کیونکہ روس کے ذریعہ دنیا سے رابطہ پیدا کرنے کا اور کچھ مطلب نہیں ہو سکتا۔

بہرحال نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ عالم اسلامی میں بالعموم اس خطرے کو محسوس کیا گیا جو پاکستان اور افغانستان جیسے مسلمان ہمسایہ ممالک میں ایسا مناقشہ پیدا ہونے کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا چنانچہ بیک وقت کئی ممالک مثلاً مصر ترکی سعودی عربیہ اور عراق نے مصالحت کی پیشکش کر دی۔ سعودی عرب نے تو اپنے نمائندہ شاہزادہ مساعد بن عبدالرحمن (شاہ سعود کے چچا) کو بھیج بھی دیا ہے۔ شاہزادہ موصوف اس وقت کابل میں ہیں۔ اور شاہی خاندان سے ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔ عراق نے کابل اور کراچی میں متعین سفیروں کو ہدایات بھیجی ہیں کہ وہ مصالحت کے لئے مناسب اقدامات کریں۔

پاکستان نے مصالحت کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ افغانستان کو ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس طرح نام نہاد پختونستان کو کسی طرح بھی زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ یہ شرط قابل فہم ہے اور چونکہ پختونستان محض ایک ڈھونگ ہے اس لئے مصالحت کرانے والوں نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ مصالحت کے ان اقدامات سے یہ خطرہ ٹل گیا ہے کہ ۱۵ مئی تک افغانستان نے اپنا رویہ نہ بدلا تو سخت اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضرورت اب پیش ہی نہیں آئے گی۔ بدقسمتی سے افغانستان دوسروں کے کھونٹوں پر ناچ رہا ہے۔ اور از رہ بے بصیری نہ اپنا مفاد دیکھ رہا ہے اور نہ اپنے ہمسائے پاکستان کا۔

متعدد ممالک اسلامیہ کا مصالحت کے لئے آمادہ ہو جانا عالم اسلامی کے لئے نیک فال ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں عالم اسلامی کے تحت لکھا تھا کہ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو۔ اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے۔ تو اس کے خلاف جنگ کرو (۴۹/۹) مقام مسرت ہے کہ اس فیصلہ کی شق اول پر عمل ہو گیا ہے۔ یہی عمل دوسری شق پر عمل کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ عالم اسلامی میں کسی مناقشہ پر اس مستعدی سے صلح کی کوششیں شروع کر دی گئی ہوں۔ یہ مستعدی مسلمانان عالم کے روشن مستقبل کی واضح علامت ہے۔ اب جب صلح کرانے والے حالات کو بچشم خود دیکھیں گے تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ کاش مسلمان اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنا ایک مشترکہ ادارہ قائم کر لیں جو انہیں ایک مرکز پر جمع کر دے۔ افغانستان جیسے بیوقوفوں کے گمراہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ممالک اسلامی کی کوئی ایسی تنظیم موجود نہیں۔ جو انہیں غلط راہ پر جانے سے روک سکے۔ افغانستان کے قضیہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کو اور زیادہ سرگرمی سے قابل عمل بنانا چاہیئے۔ جتنی جلدی ایسی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں گی فتنوں کی سرکوبی بھی اتنی جلدی ہو گی۔ ترکوں کو خصوصیت سے اس کا احساس ہے۔ چنانچہ ناٹو کونسل کے اجلاس پیرس کے سلسلہ میں ترکی کے نائب وزیر اعظم برطانیہ کے وزیر خارجہ سے ملے اور صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی مساعی کو تیز تر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ناٹو میں بھی مشرق وسطیٰ کے دفاع کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اور اس پر زور دیا گیا کہ اس کے متعلق ضروری اقدامات جلد سے جلد ہونے چاہئیں۔ تاکہ یہ خلا پُر ہو جائے۔

اردو سٹینو گرافر کی ضرورت

طلوع اسلام کے لئے ایک اچھے اردو سٹینو گرافر کی ضرورت ہے۔

تنخواہ اور تقرری کا فیصلہ ٹیسٹ کے بعد ہو گا۔

ضرورتمند حضرات فی الفور ناظم ادارہ سے ملاقات کریں۔

بیرونی حضرات کو اپنے خرچ پر ٹیسٹ کے لئے کراچی آنا ہو گا

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

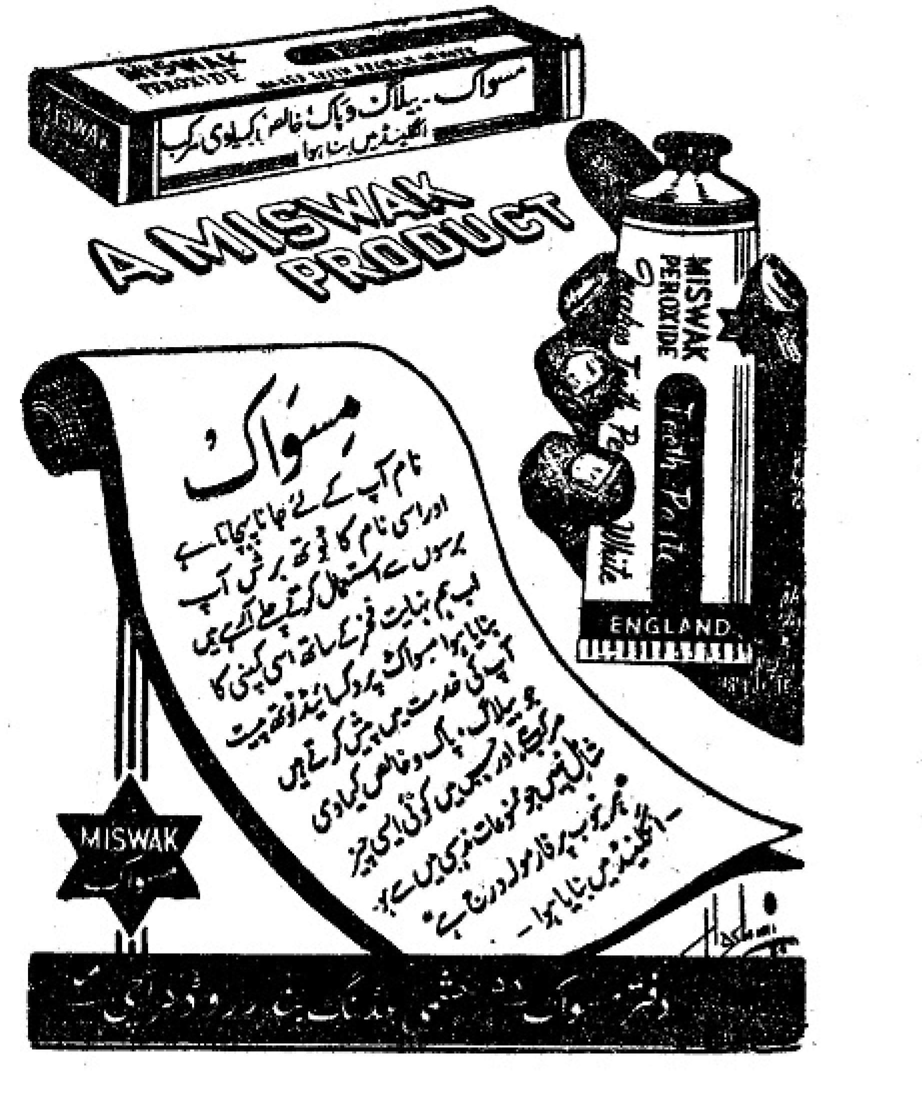

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ھے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاھیں وہ دے سکتے ھیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

شائع ہوگئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قران کی رو سے
اس زمین پر انسان کے سب سے اہم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ہے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رہی
ہے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ہے۔
رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور قران اس باب میں کیا کہتا ہے۔
چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ہے اس لئے اسے
دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھہ روپے
قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ۔ چار روپے
دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ہے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔ جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں
قسم اول از خود بھیجدی جائیگی۔ اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں یا قسم
دوم لینا چاہیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM